مولانا عبدالماجد دریابادی

یادوں کے آئینے میں

مولانا عبدالباری (ابو علی اثری)

ترتیب

ارشد علی انصاری اعظمی

مولانا عبدالماجد دریابادی

(یادوں کے آئینے میں)

تصنیف

مولانا عبدالباری (ابوعلی اثری)

ترتیب

ارشدعلی انصاری اعظمی

نام کتاب	مولانا عبدالماجد دریابادی (یادوں کے آئینے میں)
نام مصنف	مولانا عبدالباری (ابوعلی اثری) ابن رحیم بخش
نام مرتب	ارشد علی انصاری اعظمی
صفحات	۱۹۶
تعداد	۲۵۰
سنہ اشاعت	۲۰۲۰ء مطابق ۱۴۴۲ھ
کمپوزنگ	صلاح الدین نثار قاسمی معروفی 9889036799
ناشر	ارشد علی انصاری اعظمی 9369345159
طباعت	سرفراز آفسیٹ، مئو۔ 9450755820
قیمت	-/۲۵۰ روپئے

تقسیم کار :

(۱) عاصم امین، ۱۵ دلسدگارنز د جامع مسجد اعظم گڑھ (یوپی)

موبائل نمبر (1)9415277265 (2) 9336081360

(۲) گہوارۂ ادب محلہ کائستھ ٹولہ محمد آباد گوہنہ، ضلع مئو (یوپی) 9369345159

(۳) فیروز احمد انصاری کوہ نور انجینئرنگ ورکس باغ میر پیٹو محلہ آصف گنج اعظم گڑھ

موبائل نمبر: 7275797361

(۴) نعیم بک سیلر، صدر بازار، مئو ناتھ بھنجن، ضلع مئو (یوپی) 9450755820

فہرست عناوین

☆☆☆

انتساب

''مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی وادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی ان تاثراتی تحریروں اور ان کے نام اپنے چند خطوط کے اس مجموعہ کو جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی مدظلہٗ العالی کے نام معنون کرتا ہوں جو مولانا کے اسلوب تحریر کے کامیاب مقلد اور ان کے ادبی جانشین اور انہی کے اسلوب میں اپنی تحریروں کے ذریعہ ان کے علمی وادبی وصحافتی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔''

ابوعلی اثری

مصنف کا تعارفی خاکہ

نام مصنف	مولانا عبدالباری (ابوعلی اثری) ابن رحیم بخش
قلمی نام	ابوعلی اثری
تعلیم	(۱) مدرسہ اسلامیہ باغ میر پیٹو، شہر اعظم گڑھ
	(۲) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ضلع اعظم گڑھ
شغل	(۱) خدمت دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
	(۲) خدمت جامعۃ الرشاد، رشاد نگر اعظم گڑھ
تاریخ پیدائش	۱۵ر مارچ ۱۹۰۳ء
وفات	۳۰ر جون ۱۹۹۳ء مطابق ۹ر محرم ۱۴۱۴ھ بروز چہار شنبہ
مدفن	قبرستان دلیل خاں غازی، اعظم گڑھ
مستقل سکونت	محلہ آصف گنج، شہر اعظم گڑھ
تصانیف	(۱) سید سلیمان ندویؒ
	(۲) چند رجال اہل حدیث
	(۳) علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد
	(۴) امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

پیش لفظ

چکبندی قانون گو کی حیثیت سے میری پوسٹنگ کا آرڈر آ گیا تھا لیکن پوسٹنگ سے پہلے مجھے شیو گڑھ رائے بریلی میں ٹریننگ کرنی تھی اور پریکٹیکل ٹریننگ کے لئے مجھے دریاباد، بارہ بنکی جانا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ دریاباد جانے کا موقعہ از خود مل رہا تھا جہاں مجھے محترم مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے والا تھا۔ چنانچہ میں ڈاکخانہ کے پاس گلی میں ان کے دولت کدہ پر پہنچ گیا، اللہ پاک کا شکر ادا کیا کہ وہ مکان پر موجود تھے، میں نے اپنے نام کی ایک سلپ مکان کے اندر بھجوادی، جب انھوں نے پڑھا کہ میں مولوی عبدالباری ابوعلی اثری کا فرزند ہوں تو بہت خوش ہوئے اور مجھ سے ملنے کے لئے باہر نکل آئے، گورے چٹے، بھاری بھرکم، کتابی چہرہ، میانہ قد، اونچی دیوار کی ٹوپی، یہی دریابادی صاحب تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی انھوں نے دریافت کیا کہ آپ مولانا عبدالباری صاحب کے صاحبزادے ہیں، میں نے فوراً ہاتھ بڑھا دیا، بہت خوش ہوئے، اسی وقت ان کے داماد جناب عبدالقوی صاحب دریابادی تشریف لائے جن سے انھوں نے میرے والد محترم کی بہت تعریف کی، میں نے اپنی آٹوگراف بک پر ان کے آٹوگراف کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے **فلا تموتن الا و انتم مسلمون** لکھ کر دستخط کے ساتھ مکان کے اندر سے آٹوگراف نوٹ بک بھجوادی۔ ان سے ملاقات کے بعد مجھے روحانی خوشی حاصل ہوئی، انھوں نے کہا کہ جب آپ اپنے والد کے پاس خط لکھئے گا تو میرا سلام لکھ دیجیے گا۔

ویسے تو میں پہلے ہی سے نماز، روزہ اور عبادت وریاضت کا عادی تھا لیکن ان سے ملاقات کے بعد گورمنٹ سروس کے دوران آفس اور فیلڈ ورک میں کچھ اور زیادہ عبادت گذار ہو گیا۔

میرے پدر بزرگوار، مولانا عبدالماجد دریابادی کی علمی وفکری بلند قامتی کے معترف اور ان کی انشاپردازانہ صلاحیتوں کے بہت قدردان تھے۔ انھوں نے مختلف مواقع کی مناسبت سے ان کی حیات وعبقریت کے تعلق سے بہت کچھ لکھا اور رسائل وجرائد میں شائع کرایا۔ دونوں اربابِ قلم کے مابین خط وکتابت کا خوش گوار سلسلہ بھی جاری تھا۔ تاثراتی تحریریں اور جانبین کے خطوط مولانا دریابادی کی حیات وفکر کے مختلف گوشوں کو روشن کرنے میں معاون ہیں۔ اسی خیال سے والد محترم نے ان کو قوم وملت کی علمی وادبی امانت کی طرح محفوظ رکھا اور علمی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ''مولانا عبدالماجد دریابادی یادوں کے آئینے میں'' کے نام سے مرتب کیا اور زیور طبع سے آراستہ کر کے علمی حلقوں کے حوالے کرنا چاہا لیکن اسباب ووسائل فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ابا جان کا یہ مسودہ ''مولانا عبدالماجد دریابادی یادوں کے آئینے میں'' ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا، لیکن میں نے عہد کر لیا تھا کہ کتابی شکل میں ہر حالت میں اس کو شائع کروں گا۔ جناب مولانا صلاح الدین معروفی صاحب نے اس کو کمپیوٹرائزڈ کیا اور اس کو شائع کرانے میں اپنا بھرپور تعاون دیا جس کے لئے میں ان کا ممنون ومتشکر ہوں۔ امید ہے ارباب فضل وکمال اس پیشکش کو قبولیت کی سند سے نوازیں گے اور اپنی قیمتی آرا سے شادکام کریں گے۔

ارشد علی انصاری اعظمی

تعارف

مولانا عبدالباری ابوعلی اثری (۱۹۰۳۔۱۹۹۳) قلب شہر کے باشندے، مدرسۃ الاصلاح کے متعلم، سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴۔۱۹۵۳) کے معاون، پروف ریڈر تھے اس تعلق سے وہ دارالمصنفین، شبلی کالج، مدرسۃ الاصلاح، شبلی منزل کے باوقار واردین ومہمانان کرام، اہم کتب و رسائل کا بولتا اشاریہ (انڈیکس) بن چکے تھے۔ وہ شبلی ومتعلقات شبلی، دیار پورب کے قریات و قصبات، عظیم شخصیات، تحریکات واداره جات اور شہر وضلع اعظم گڑھ کے تفردات واولیات کا چلتا پھرتا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تھے۔ان کا حافظہ گراں قدر دارالمعلومات سے کم نہ تھا جس سے ہر کوئی استفادہ کرتا تھا۔ وہ بہت سی کشمکش کے چشم دید گواہ تھے۔ان کی یادوں کا نگارخانہ طرح طرح کی تصویروں سے مزین تھا۔ وہ اپنے عصر کے نہایت معتبر راوی اور وقائع نگار تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷) علامہ شبلی کے خرمن علم ودانش کے خوشہ چیں اوران کے آستانِ علم وفضل شبلی منزل کے تزئین کاروں میں سے ایک تھے۔ وہ مجموعہ اضداد ہونے کے باوجود اپنی دیدودانش کی تکثیری جہات کے باعث عباقرۂ روزگار کی صف میں گنے جاتے تھے۔

ان دونوں کی تحریروں کے آئینہ خانے میں شبلی کے ادب وانشا کی چاندنی چھٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ ایک ہی دبستان فکروخیال اور مدرسہ فضل وکمال کے سبق آموز وکتاب خواں باہم صورت ناشناس ولاتعلق رہ جاتے۔ دونوں اصحاب نگارش ایک دوسرے کی تحریروں میں اپنے لئے کشش محسوس کرتے تھے۔ علمی وقلمی میدان کی اسی ہم ذوقی وہم رکابی، طرز تحریر کے شجرۂ نسب کی رو سے ہم قبیلہ ہونے کے رشتے اور دارالمصنفین کے نوروشعور کے دھارے کو تیز تر کرنے میں دونوں کی شرکت وشمولیت نے ایک دوسرے کے درمیان میں واقع تمام زمانی ومکانی فاصلوں کو سمیٹ دیا تھا اس لئے دونوں ہی ایک دوسرے کے دروں بین وحقیقت آگاہ ہو چکے تھے۔

ابوعلی اثری کی فتوحات قلم کے زیادہ تر حصے کا تعلق شبلی و آستانہ شبلی کے متعلقات و

انسلاکات سے ہے ان کا خامہ رنگیں انھیں موضوعات کو مطاف فکر بناتا اور انھیں کے گرد گھومتا ہے۔ ان کے آثار قلم فکری وفنی جہات کی وجہ سے تاثراتی تحریروں کے زمرے میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔ زیر نظر کتاب ''مولانا عبدالماجد دریابادی - یادوں کے آئینے میں'' بھی اسی قبیل کے ان مختصر و متوسط بیانیے کا دلکش مجموعہ ہے جو وقفے وقفے سے اردو کے مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہو کر تحسین سخن شناس کا اعزاز پاتے رہے۔ وقائع نگاری کا یہ ادبی مرقع دبستان شبلی کے نسبتاً ایک کم معروف لیکن ممتاز انشا پرداز کے تقلیدی ونیم اجتہادی، آدھے ادھورے تجدیدی وتوسیعی پہلوؤں کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس میں اسلوب شبلی وطرز سلیمان کا نہایت کامیاب تتبع بھی ہے اور لکھنے والے کا رنگ طبیعت اور خون جگر بھی شامل ہے۔ ان دونوں عناصر کی ہم آمیزی نے اظہار خیال کو قارئین کے لئے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ بیان واقعہ کے استناد و استشہاد کے بارے میں بلا تردد کہا جا سکتا ہے کہ واقعات شنیدہ نہیں دیدہ ہیں۔ راوی معتبر ہونے کے علاوہ خود اس کی ذات بھی بعض وقوعے کا حصہ ہے۔ یہ تاثرات ایسے کثیر الجہات مرد قلندر کی ذات وصفات، فکر ونظر، تحلیل وتجزیہ اور نقد وجرح کے بارے میں ہیں جس کی ہر ادا خود دیکھنے والے کو اپنے رنگ وتماشا اور زرنگار قلم کی جلوہ سامانیوں کی بیکراں خلد طربناک میں گما دیتی ہے۔ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب روبرو شخصیت اپنی حقیقت میں مجموعۂ اضداد بھی ہو۔

کتاب کے مشمولات، تراشے مضامین وخطوط سے بہت سے تاریخی شواہد، عصری مسائل ومباحث، بزم نشاط علمی کے کھٹے میٹھے ذائقے، دین وسیاست کی سمت ورفتار، تمدن وصحافت کے نشیب وفراز، امیدوں کے طلوع وغروب کے انبساط وانقباض، اہل علم ونظر کے اختلافات ومناقشات، سمندر کی ساکن موجوں کے نیچے جوار بھاٹے کی دکھائی نہ دینے والی کیفیات کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اگر ابو علی اثری اپنی یادوں کو تازہ نہ کرتے تو بہت سے دلچسپ گوشے نزاد نو کے دائرہ علم وخبر سے پرے رہ جاتے جو ایک بڑا علمی وتمدنی خسارہ ثابت ہوتا۔

۲۲ مارچ ۲۰۲۰ء یکشنبہ

قمر الزماں مبارک پوری

مولانا عبدالماجد دریابادی سے میرا تعارف

مجھے دارالمصنفین کے ایک کارکن کی حیثیت سے مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں نیاز تو دارالمصنفین سے ابتدائے تعلق کے زمانہ ہی سے حاصل تھا، وہ جب بھی دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے تشریف لاتے تھے ان کی دُور سے وہ بھی دفتر کے اوقات میں، مسجد میں ظہر وعصر کی نمازوں میں زیارت بھی ہو جاتی تھی اور ان کی ایک ایک ادا میرے لئے بے حد پر کشش اور جاذب نظر ہوتی تھی اور میں اس سے حظ اٹھاتا تھا اور کبھی کبھی سلام ومصافحہ کی سعادت بھی حاصل ہو جاتی تھی، ان کے ادب وانشاء کا پرستار تو میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھا اور ان کا ایک ایک حرف بہت لذت لے لے کر پڑھتا تھا، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کی پر فیض صحبت میں جہاں میں نے ان کی زبان مبارک سے ہندوستان کے ان تمام ادیبوں، انشاء پردازوں اور شاعروں کے جوان کو پسند تھے، نام سنے، بزم شبلی کے ایک اہم رُکن، ندویوں کے ہم فکر اور وقت کے ایک بلند پایہ فلسفی کی حیثیت سے ان کا نام بھی سنا اور انہی کے ساتھ ان کے ہم فن، ہم ذوق، ہم فکر مولانا عبدالباری ندوی کا نام بھی لیکن ان کی کسی کتاب سے واقف نہیں ہو سکا، حالانکہ اس وقت تک ان کی ''روح الاجتماع فلسفۂ جذبات، لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ'' شائع ہو چکی تھیں اور اہل ذوق تک پہنچ چکی تھیں اور ''فلسفۂ جذبات'' کی تو سارے ملک میں بڑی شہرت تھی اور بعض اصطلاحات کے موزوں اور صحیح ہونے پر ان میں اور مولانا ابوالکلام میں ''الہلال'' کے صفحات ہی میں قلمی جنگ بھی ہو چکی تھی، ان کی برکلے کے سلسلے میں ایک اور اہم کتاب ''مکالمات برکلے'' تھی جو دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہو چکی تھی، میرے چچا ماسٹر محمد احمد صاحب جنھوں نے عربی کی ابتدائی تعلیم کانپور کے اُس مشہور مدرسہ فیض عام میں حاصل کی تھی جس

کے پہلے جلسہ دستار بندی کے موقع پر مختلف مکاتب فکر اور مسالکِ فقہ کے علماء کے ایک اجتماع میں ندوہ کا ایک تصور پیدا ہوا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر شعبہ انگریزی کے صدر تھے، انگریزی کے بہت اچھے استاد اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، وہاں کوئی غیر معمولی مہمان آتا تھا تو اس کی شان میں یہی قصیدہ اور نظم لکھتے تھے جس پر ان کو بڑی قدرت تھی، انہی نے ایک مرتبہ اعظم گڑھ میں کہا کہ شبلی منزل میں ہندوستان کے مشہور فلسفی مولانا عبدالماجد دریابادی آئے ہوئے ہیں جاؤ ان کو دیکھ آؤ۔ میں شوقِ زیارت میں شبلی منزل اس وقت پہنچا جب کہ تمام ساکنانِ شبلی منزل دسترخوان پر تھے اور کھانا تناول فرمارہے تھے، میں ان کو پہچان نہ سکا اور ناکام واپس چلا آیا۔ دارالمصنفین سے میرا تعلق ہوا تو مجلس انتظامیہ وعاملہ کے جلسوں کے موقع پر جن میں وہ شرکت کے لئے بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے میں گو ان کی زیارت برابر کرتا رہا اور ان کو بڑی عقیدت سے دیکھتا رہا لیکن میں تحریک پاکستان کے شروع ہونے سے پہلے تک ان سے بیگانہ ہی رہا، اس عرصہ میں بحیثیت دارالمصنفین کے ایک رکن کے، کسی صاحب نے بھولے سے بھی میرا ان سے تعارف نہیں کرایا، حالانکہ میں اپنے ادبی ذوق کی بنا پر اول دن سے ان سے تعارف کا مستحق تھا اور پھر میں ان کے دوست اور ''سچ'' کے شریک ادارت مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کا شاگرد بھی تھا۔ مولانا عبدالباری ندوی دارالمصنفین میں رہ چکے تھے جب تک یہاں رہے میرا بڑا خیال کرتے رہے، وہ بھی مجلسِ انتظامیہ کے ممبر تھے اور جب بھی وہ اس کی میٹنگ میں شرکت کے لئے آتے تھے اور مجھ ناچیز پر ان کی نگاہ پڑتی تھی تو ''مسمی'' کہہ کر میری پذیرائی کرتے تھے اور بڑے اخلاق ومحبت سے پیش آتے تھے۔

مولانا سے میری ملاقات اور تعارف کی ایک تاریخ ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی تحریک کی حمایت میں روزنامہ ''منشور'' دہلی ''نوائے وقت'' لاہور ''حق'' لکھنؤ اور دوسرے اخبارات میں میرے مضامین برابر نکلتے رہے اور وہ مولانا کی نظر سے گذرتے رہے اور ان کے اسلوب اور اندازِ تحریر سے متاثر بھی ہوتے رہے لیکن بہت دنوں تک ان کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کا لکھنے والا کون ہے۔ اسی دوران میں ان کی ملاقات مولانا شاہ معین الدین ندوی سب اڈیٹر

''معارف'' سے لکھنؤ میں ہوئی تو مولانا کے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ'' ان کا لکھنے والا ہمارے دارالمصنفین ہی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ مولوی عبدالباری ہیں جو ہمارے کتب خانہ کے مہتمم اور دارالمصنفین کے مصحح ہیں۔آپ نے ان کو بار بار دارالمصنفین میں دیکھا بھی ہوگا ان کو لکھنے پڑھنے کا ذوق تو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کی صحبت میں پیدا ہوا اور وہاں ان کے زیر سرپرستی کچھ لکھتے پڑھتے بھی رہے لیکن اس میں جلا دارالمصنفین میں سید صاحب کے سایۂ شفقت میں ہوئی۔ہمارے سید صاحب تصحیح کے سلسلے میں ان پر بڑا اعتماد کرتے ہیں اور ہم رفقاء بھی ان کے اس ذوق کی بڑی قدر کرتے ہیں۔وہ ابوعلی کے قلمی نام سے روزنامہ ''منشور'' دہلی اور دوسرے پاکستانی اخبارات کے ذریعہ بالکل پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئے ہیں،ہم لوگوں کو بھی پتہ نہیں تھا کہ ان مضامین کا لکھنے والا کون ہے، پڑھتے ہم سب تھے یاد نہیں آتا ہے کہ کس تقریب سے ہمیں علم ہوا، رفتہ رفتہ جب اس کا علم خود سید صاحب اور مولانا مسعود علی ندوی کو ہوا تو یہ حضرات بھی ان کے مضامین پڑھتے تھے۔''اس مفصل غائبانہ تعارف کے بعد وہ بھی دارالمصنفین کے ایک سینئر رفیق ''معارف'' کے سب اڈیٹر، متعدد کتابوں کے مصنف مولانا شاہ معین الدین ندوی کی زبان سے تو مولانا کے دل میں مجھ جیسے ہیچ میرز دکم سواد کو دیکھنے اور ملاقات کرنے کی بڑی خواہش پیدا ہوئی، اس تعارف کی اطلاع خود مجھ کو مولانا شاہ معین الدین نے لکھنؤ ہی سے خط لکھ کر دی۔اس کے بعد جب وہ حسب معمول دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے تشریف لائے تو پھاٹک میں داخل ہوتے ہی مولانا مسعود علی ندوی اور دوسرے لوگوں سے جوان کے استقبال کے لئے کھڑے تھے پوچھا کہ آپ کے یہاں وہ ابوعلی کون ہیں جن کے تحریک پاکستان کی حمایت میں روزنامہ ''منشور'' وغیرہ میں بڑے ولولہ انگیز مضامین نکل رہے ہیں۔میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔دوسرے روز حسب معمول جب میں دارالمصنفین گیا تو مولانا مسعود علی ندوی نے مجھ کو اپنے دفتر بلایا جہاں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تشریف فرما تھے۔مجھ سے فرمایا کہ یہ مولانا جب سے آئے ہیں تمہارے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔میں مولانا کو سلام اور مصافحہ کر کے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔اب میں ان کو دیکھ رہا ہوں اور وہ مجھ کو دیکھ رہے ہیں باہم کوئی

بات چیت نہیں ہوئی، ممکن ہے کہ اپنے تصور کے خلاف مجھ کو دیکھ کر ان کو حیرت اور استعجاب بھی ہوا ہو کہ پرسنالٹی تو کچھ بھی نہیں ہے یہ منحنی سا آدمی اتنے ولولہ انگیز مضامین کیسے لکھتا ہے۔ بہر حال مولانا مسعود علی ندوی کی موجودگی میں ان کی پر مسرت زیارت اور ملاقات رفتہ رفتہ محبت اور عقیدت میں تبدیل ہوگئی، اس کے بعد جب جب مولانا مجلس عاملہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں ان سے ملتا رہا اور وہ مجھ ناچیز سے بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے رہے۔

ایک مرتبہ ان سے ملنے کے لئے گیا تو بڑے بڑے اکابر اور شہر کے عمائد بیٹھے ہوئے تھے، میں سلام و مصافحہ کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر واپس ہونے لگا تو مجھ کو رخصت کرنے کے لئے بے اختیار کمرے سے باہر نکل آئے، فرمایا یہ ملاقات تو بہت سرسری رہی ابھی میں کل تک رہوں گا انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ میں دوسرے روز جب کہ وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھے، ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو بہت دیر تک اپنی "تفسیر ماجدی" انگریزی و اردو اور نئی نئی قرآنی تحقیقات پر گفتگو فرماتے رہے، فرمایا کہ عام طور سے جو یہ مشہور ہے کہ مصر کے دریائے نیل میں فلاں جگہ فرعون غرق ہوا تھا وہ صحیح نہیں ہے، میری تحقیقات کے مطابق اس کے غرق ہونے کی جگہ بحرِ قلزم میں ہے، اس موضوع پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے اور میں لطف و مسرت کے ساتھ سنتا رہا، میں نے عرض کیا کہ آپ کی اردو تفسیر جو تاج کمپنی لاہور نے بڑے اہتمام سے طبع کی ہے اس کو میں نے خادم زادہ مقیم کراچی کے ذریعہ ۸۰ روپیہ میں منگوایا ہے اور وہ میرے مطالعہ میں ہے تو بڑی مسرت کا اظہار کیا پھر فرمایا کہ مجھ کو تاج کمپنی کا یہ ایڈیشن مختلف وجوہ سے پسند نہیں آیا میں اس پر مزید نظر ثانی اور کچھ جدید معلومات کا اضافہ کر کے از سر نو ہندوستان میں اپنے خاص اہتمام میں چھپواؤں گا۔

مولانا آخری مرتبہ ۱۹۷۶ء میں مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے اور حسب معمول کتب خانہ پہنچنے کے بعد مجھے اس کا علم ہوا تو ان سے ملنے کے لئے مہمان خانہ میں گیا تو وہ بیت الخلاء میں تھے، مگر ان کو میرے آنے کی آہٹ ہوگئی تھی۔ بیت الخلاء سے نکل کر سیدھے برآمدہ میں آئے دیکھا کہ ان کی آنکھ پر سبز پٹی بندھی ہوئی ہے جس کا ابھی ابھی لکھنؤ میں آپریشن کرایا تھا، بڑی گرمجوشی سے ملے، معانقہ کیا۔ فرمایا کہ اب کی مرتبہ سفر میں مجھے بڑی

تکلیف ہوئی۔ چلا تو میں دریاباد سے وقت ہی پر لیکن گاڑی کے حد درجہ لیٹ ہو جانے کی وجہ سے یہاں رات کے ۸ بجے پہنچا اور پہنچتے ہی مجھ کو پیچش ہو گئی، ابھی واپس جا رہا ہوں جب ان کو اسٹیشن تک صباح الدین صاحب، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، ان کے ہم وطن رفیق دارالمصنفین مولوی عمیر الصدیق ندوی وغیرہ پہنچانے کے لئے جانے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا مجھ کو اسٹیشن پر رکشہ سے اترتے ہوئے دیکھا تو بہت خوش ہوئے میں انہی کے ساتھ اسٹیشن کے اندر داخل ہو کر لوہے کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ان کے بغل میں صباح الدین صاحب بیٹھے تھے، میں نے ''آپ بیتی'' کے چھپنے کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا دارالمصنفین نے لے لیا ہے۔ عمیر الصدیق صاحب کا ذکر آیا تو فرمایا کہ یہ جب ندوہ میں پڑھتے تھے تو ڈھیروں نمبر لاتے تھے، یہ دارالمصنفین کی رفاقت کے لئے موزوں ہیں۔ صباح الدین صاحب نے فرمایا کہ یہ گھر بہت جاتے ہیں، ان سے فرمادیجئے کہ اب زیادہ سے زیادہ اپنا دل یہیں لگائیں اور پڑھیں لکھیں، گاڑی اسٹیشن سے مخالف سمت سے دوسری گاڑی کے آنے کی وجہ سے کافی فاصلہ پر کھڑی تھی۔ آنکھ کی اس معذوری میں بمشکل تمام گاڑی تک پہنچ کر سوار ہوئے۔ ہم تمام لوگ بھی جب تک گاڑی نے سیٹی نہیں دی انہی کے ڈبہ میں تھے اور وہ صباح الدین صاحب سے باتیں کرتے رہے۔ گاڑی نے سیٹی دی تو رخصت ہو کر گاڑی سے اتر گئے۔ یہ میری اعظم گڑھ میں ان سے آخری ملاقات تھی۔

اس سے پہلے ۷۵ء اکتوبر کی آخری تاریخوں میں ندوہ کا ۸۵ سالہ جشن ہونے والا تھا۔ میرے نام بھی اس میں شرکت کا باقاعدہ دعوت نامہ آیا تھا، اس زمانہ میں میرے بائیں بازو میں بڑی شدید تکلیف تھی، اپنے سے کپڑے بھی نہیں پہن سکتا تھا، نہ ذرہ برابر چین تھا، پھر بھی میں اس میں شرکت کے لئے تیار ہو گیا اور میں جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ساتھ پہنچ گیا، ندوہ میں پہلے ہی سے ہم اعظم گڑھ والوں کے لئے ایک کمرا الاٹ تھا، اسی میں ٹھہرے، دوسرے دن ۹، ۱۰ بجے کے قریب دن میں ایک کار دارالعلوم کے صدر دروازہ کے پاس رکی تو دیکھا اس میں مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا محمد اویس نگرامی ندوی تھے۔ میں اس کے قریب پہنچا تو مولانا منظور نعمانی اڈیٹر ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ زائرین کو ہٹا رہے تھے، میں نے

از خود ہٹنا چاہا تو فرمایا کہ آپ کھڑے رہئے۔ میں نے دونوں بزرگوں سے سلام مصافحہ کے بعد مولانا محمد اویس ندوی سے عرض کیا کہ میں تو ابھی ابھی آپ کی عیادت کے لئے آپ کے یہاں آنے والا تھا، آپ سے خوب ملاقات ہوگئی۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ راستہ میں دریاباد کا اسٹیشن آیا تو بے اختیار آپ کی یاد آگئی اور پھر خیال آیا کہ اس وقت تو آپ لکھنؤ ہی میں ہوں گے، وہیں پہنچ کر شرف ملاقات حاصل کروں گا، مگر اس وقت ان دونوں بزرگوں کی پذیرائی کے لئے منتظمین میں سے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس لئے گاڑی پر بیٹھے بیٹھے واپس چلے گئے اور ندوہ کے اس چار روزہ جشن میں کسی دن بھی منتظمین کے اغماض کی وجہ سے یہ دونوں بزرگ شریک نہیں ہوئے، نہ اس کا پورے جشن کے زمانہ میں کسی کو خیال آیا۔ مولانا نے بعد میں ''صدق جدید'' میں اس پر بڑا تلخ نوٹ لکھا جو مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نظر سے بھی ضرور گذرا ہوگا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ ندوہ میں مجھے کوئی رہنما نہیں ملا کہ کسی دن ''خاتون منزل'' جاکر ان سے مل کر اپنا دیدۂ و دل روشن کرتا، میں ان کی ملاقات کی حسرت لے کر اعظم گڑھ واپس آیا۔

۷ر جنوری ۱۹۷۷ء کو ایک طویل اور تکلیف دہ بیماری کے بعد وہ انتقال کر گئے۔ اعظم گڑھ میں یہ المناک خبر آئی تو جنازہ میں شرکت کے لئے دارالمصنفین کی طرف سے صباح الدین صاحب نے رفقاء کا ایک وفد بھیجا، میں بھی اس میں شریک ہوگیا، ہم لوگ بس سے سلطان پور ہوتے ہوئے لکھنؤ ۹، ۱۰ بجے رات کو پہنچے تو معلوم ہوا کہ جنازہ مغرب سے پہلے ہی ندوہ میں نماز جنازہ ہونے کے بعد دریاباد روانہ ہوگیا۔ اب وہاں سے لوگ لوٹ رہے ہوں گے۔ رات ہم نے خاتون منزل کے قریب ہی ایک مسجد میں گذاری اور صبح ہوتے ہی ''خاتون منزل'' گئے تو مولانا کے بھتیجے ہاشم صاحب اور حبیب صاحب سے تعزیت کی۔ ہم کو مولانا کا باہری وہ کمرا بھی دکھایا گیا جس میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ اسی میں غسل اور تکفین وغیرہ بھی ہوئی تھی، کمرے کی تمام چیزیں منتشر تھیں، کافور کے ذرّے بھی اب تک اس پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کمرے کو دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ ع

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

ہاشم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی نے ہم لوگوں کی چائے سے تواضع فرمائی، پھر

وہاں سے ہم سب لوگ مولانا کی تعزیت کے لئے ان کے سب سے زیادہ مخلص دوست اور عقید تمند مولانا ابوالحسن علی ندوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ان کی وفات سے بہت ہی غمزدہ تھے، فرمایا کہ مولانا ''مجموعہٗ اضداد'' تھے، مگر بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ واپسی میں میری بڑی خواہش تھی کہ دریاباد اتر کر اور مزارِ پُر انوار پر جا کر فاتحہ پڑھوں مگر میں یہ سعادت حاصل نہ کرسکا جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی علامہ شبلی نعمانی کی قربت میں

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا سید سلیمان ندوی کی طرح مولانا شبلی کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے، لیکن کنگ کالج لکھنؤ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا شبلی کی صحبتوں میں اتنا اُٹھے بیٹھے اور ان سے اتنا فیض اٹھایا کہ اگر ان کو بھی مولانا شبلی کا شاگرد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دفتر سیرت نبوی میں وہ انگریزی میں مولانا کے اسسٹنٹ بھی رہ چکے ہیں، سیرت سے متعلق مستشرقین یورپ کی بعض کتابوں کا ان کی فرمائش سے خلاصہ بھی کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں شبلی کے ادب وانشاء کی پوری جھلک ملتی ہے اور مجھے ان کے پڑھنے میں بڑا مزا ملتا ہے مگر اب تو وہ خود صاحب طرز انشاء پرداز ہوگئے ہیں اور ان کی علمی وادبی خدمات کا دائرہ بھی اتنا وسیع ہوگیا ہے اور اس مدت میں اتنے علمی کارنامے انجام دیئے ہیں اور اردو میں اپنے قلم سے اتنا سرمایہ جمع کر دیا ہے کہ حیات شبلی اور حیات سلیمان کی طرح ان کی بھی ایک ضخیم سوانح عمری لکھی جاسکتی ہے، اور یہ فریضہ بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین سے طویل تعلق کی بنا پر ندوہ کے فضلاء پر ہوتا ہے اور ان میں سے جس کو بھی ان کی ذات سے عقیدت ہو اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ فروغ اردو لکھنؤ نے اگرچہ ان پر ایک خاص نمبر شائع کیا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ نمبر اور اس طرح کا کسی بھی رسالہ کا خاص نمبر

کسی کی سوانح عمری کا بدل نہیں ہوسکتا۔نہ خاص نمبروں کی مستقل کتاب کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہوتی ہے، سید صاحب کی یادگار میں معارف کا سلیمان نمبر شائع ہوا تو کہاں لوگوں نے اس پر قناعت کی، مستقل سوانح عمری کی طلب شائقین کی طرف سے برابر جاری رہی اور وہ طلب ان کے جانشین مولانا شاہ معین الدین ندوی کے قلم سے پوری ہوگئی، اسی طرح مولانا عبدالماجد کی بھی سوانح عمری لکھی جانی چاہئے جس کے وہ اپنے شاندار علمی وادبی وتفسیری کارناموں کی بناپر بجاطور پر مستحق ہیں۔

یزید بن معاویہ کے متعلق استفسار

اور

مولانا عبدالماجد دریابادی کا جواب

انبیاء علیہم السلام کے سواہر شخص کی زندگی کے تاریک اور روشن پہلو دونوں ہوتے ہیں اور مؤرخ اور واقعہ نگار کا فرض ہے کہ اس کی سیرت قلم بند کرتے وقت دونوں پہلو پیش کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو درحقیقت تاریخ نویسی اور واقعہ نگاری کے اہم فرض کی ادائیگی سے قاصر ہے، اس کے لئے بہتر ہے کہ تاریخ نویسی کے بجائے مداحی اور منقبت سرائی کا پیشہ اختیار کرلے کہ اس کے بعد وہ جو کچھ لکھے گا اس کو کوئی ٹوک نہیں سکتا لیکن جب وہ تاریخ نویسی اور سیرت نگاری کا قلم ہاتھ میں لے گا تو اس کی غلط نویسی پر ارباب قلم، محقق خاموش نہیں رہ سکتے۔

یزید اپنی سیرت ، اعمال، عادات، واخلاق کے لحاظ سے جیسا رہا ہو لیکن ہمارے اردو مؤرخوں نے حادثہ محزنہ کربلا کے بیان کرنے میں اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے، وہ انسان تھا اور خطاونسیان سے مرکب انسان تھا۔اس سے اگر غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی تو یقیناً بہت سی

نیکیوں کا بھی ظہور ہوا ہوگا۔ بچپن سے لیکر خلیفہ ہونے تک اس کی زندگی یکساں نہیں گذری ہوگی، وہ اگر فسق و فجور کا مرتکب ہوا ہوگا تو بلاشبہ زہد و تقویٰ کے بھی کچھ کام ضرور کیئے ہوں گے۔ اگر وہ کبھی رندوں کی صحبت میں بیٹھا ہوگا تو اصحاب ورع و تقویٰ کی مجلس میں بھی نظر آیا ہوگا۔ ایسا تو نہیں ہوگا کہ شروع سے اخیر زندگی تک معاصی و سیئات کے سمندر ہی میں غرق رہا ہو اور اس سے کوئی ایک کام بھی اچھا نہ بن آیا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ واقعہ شہادت حسینؓ اس کے عہد حکومت میں وقوع پذیر ہوا، اور تختِ خلافت پر متمکن ہونے کی بنا پر اس غم انگیز حادثہ کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے کہ ایک بادشاہ کا فرض ہے کہ اپنے حدودِ سلطنت کے جزئی سے جزئی واقعہ کی خبر رکھے جہاں عدل و انصاف کا خون ہوتا ہو، بے کسوں اور لاچاروں پر ظلم ہوتا ہو، معصوم و بے گناہ اشخاص کو سزائیں دی جارہی ہوں۔ قزاقوں اور رہزنوں سے ملک کا امن خطرہ میں پڑ گیا ہو، عمال سلطنت جبر و ظلم پر اتر آئے ہوں۔ رعایا کی عزت و آبرو محفوظ نہ ہو، اس کا تدارک کرے عدل قائم کرے لیکن اگر اس سے اس میں کوتاہی ہوگئی ہو تو اس کو یکسر گناہ گار اور ملعون ثابت کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

خدانخواستہ شہ سوار دوش رسولؐ، جگر و جانِ بتول، چشم و چراغ دودمان ہاشم، سردار نوجوان قریش دست و بازوئے علیؓ، حضرتِ امام حسینؓ کی مظلومیت پر پردہ ڈالنا اس داعیہ کبریٰ سے متعلق جتنی بھی ذمہ داری یزید بن معاویہ پر عائد ہوتی ہے، اس سے اس کو سبکدوش کرنا مقصود نہیں ہے لیکن بہرحال یہ واقعہ تاریخی ہے اور تاریخی نقطہ نظر سے اس کو دیکھنا بھی چاہئے۔ اس واقعہ میں جو لوگ شریک تھے ان کے اعمال و افعال ان کے کفر و ایمان اور زندقہ و اسلام کا نہیں ہو سکتے۔ یعنی قیامت کے دن یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یزید اس کے ولاۃ اور ارکان حکومت کو تم کیسا سمجھتے تھے، شہید کربلا حضرت امام حسینؓ اور ان کے باوقار ساتھیوں کے متعلق تمہاری کیا رائے تھی، اس قسم کی چیزیں ایمانیات میں شامل نہیں ہیں، آپ سے صرف آپ کے اعمال کے متعلق باز پرس ہوگی۔

مقصود یہ ہے کہ جو جیسا ہو اس کے متعلق ویسی ہی رائے قائم کرنا چاہئے، کسی کے متعلق غلط رائے قائم کر لینا یا کسی کی طرف ایسی بات منسوب کر دینا جو اس سے نہ ہوئی ہو بد دیانتی ہے۔ حق

پرست مسلمان کو اس سے بچنا چاہئے۔ خدائے بصیر و علیم سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے جو جیسا ہوگا اس کو ویسا ہی بدلہ ملے گا لیکن ہم کسی کے لئے اپنا نامہ اعمال کیوں کر خراب کریں۔

مدیر صدق جناب مولانا عبدالماجد دریابادی کے ایک خاص مخلص نے عرصہ ہوا موصوف سے یزید کے متعلق چند سوالات کئے تھے چونکہ ان کا تعلق تاریخ سے تھا، اس لئے انھوں نے ایک صاحب نظر ندوی عالم کو ان کا جواب لکھنے کی زحمت دی، انھوں نے بکمال کرم مشقت اٹھا کر تاریخ وسیر کی کتابوں سے یزید کے متعلق صحیح و مستند روایات لکھ کر بھیج دیں جن کو انھوں نے افادۂ عام کے خیال سے اپنے موقر پرچہ میں شائع کر دیا ہے، ہم وہ سوالات اور ان کے جوابات افادۂ مزید کے خیال سے صدق سے نقل کر کے شائع کر رہے ہیں کہ ایک حق کی بات کی اشاعت جتنی ہو، اچھا ہے۔

الصدق ینجی والکذب یھلک

(صدق۔ ۱۱ر جون ۱۹۳۷ء)

سوال نمبر (۱) آیا یہ صحیح ہے کہ یزید نے قسطنطنیہ پر جہاد کیا تھا اور جہاد بھی بحیثیت امیر وافسر کے۔

(۲) آیا یہ صحیح ہے کہ اس لشکر سے متعلق حدیث نبوی میں بشارت آچکی تھی۔

(۳) اگر پہلی دونوں باتیں صحیح ہیں تو پھر یزید کے متعلق صحیح سنی عقیدہ کیا رکھنا چاہئے؟

پہلے سوال کا جواب تمام تر تاریخ سے متعلق تھا، اس کے لئے جن صاحب نظر ندوی عالم کو تحقیق کی زحمت دی گئی تھی انھوں نے حسب ذیل روایات لکھ کر ماجد صاحب کو بھیجیں۔

جواب (۱) ابوایوبؓ نے ۵۲ھ میں جب یزید بن معاویہ نے اپنے باپ کی خلافت کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر فوج کشی کی تھی وفات پائی، اور یزید نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

(طبقات ابن سعد جلد ۳، ق ۲، ص ۵۰)

(۲) ابوایوبؓ نے ارض قسطنطنیہ میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں خلافت معاویہ کے زمانہ میں یزید کے جھنڈے کے نیچے وفات پائی۔ (استیعاب ابن عبدالبر (ج ۲، ص ۶۳)

(۳) ابوایوبؓ آنحضرتؐ کے بعد ہمیشہ جہاد میں رہے تا کہ آنکہ قسطنطنیہ کی فوج کشی

میں وفات پائی، معاویہ نے اپنے لڑکے یزید کو ۵۵ھ میں صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بری وبحری مہم میں بھیجا تھا وہ قسطنطنیہ پہنچ گیا، اور باب قسطنطنیہ پر اہل قسطنطنیہ سے جنگ کی۔

(حافظ ابن حجر ج۲،ص۹۰)

(۴) ۴۹ھ میں یزید ابن معاویہ نے روم پر فوج کشی کی اور قسطنطنیہ تک پہنچ گیا، اس فوج میں ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ اور ابوایوبؓ انصاری تھے۔ (تاریخ طبری جلد۷،ص۸۶)

(۵) ۵۰ھ میں امیر معاویہؓ نے سفیان بن عوف کی ماتحتی میں ایک بڑا لشکر روم روانہ کیا اور یزید کو اس میں شرکت کا حکم دیا لیکن وہ بہانہ کر کے رک گیا، مسلمانوں کو اس مہم میں فاقہ اور بیماری کی مصیبتوں میں مبتلا ہونا پڑا، یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپنے نہ جانے پر اظہار مسرت کیا، امیر معاویہؓ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئے اور اس کو زبردستی عقب سے مزید فوج کے ساتھ اس لئے روانہ کیا کہ وہ بھی ان مصائب کا مزہ چکھ لے، اس فوج میں ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابن زبیرؓ اور ابوایوب انصاری تھے، یہ لوگ بڑھتے ہوئے قسطنطنیہ تک پہنچ گئے۔

(تاریخ ابن اثیر جلد۳،ص۳۸۰)

(۶) ابوایوبؓ انصاری نے ۵۰ھ یا ۵۱ھ ۵۲ھ میں جہاد کی حالت میں وفات پائی۔ اس فوج کا امیر یزید ابن معاویہ تھا۔ (اسد الغابہ ابن اثیر ج۲،ص۸۹)

بہر حال اس قدر محکم ہے کہ اکابر صحابہ نے یزید کی ماتحتی میں جہاد کیا، سوال اول سے متعلق اتنی تاریخی شہادتوں کے بعد سوال دوم وسوم کچھ غیر ضروری سے رہ جاتے ہیں، اگر متعین طور پر اس لشکر سے متعلق کوئی بشارت نہ بھی ہو تب بھی مجاہدین کو جو مرتبہ اسلام نے دیا ہے وہ کوئی مخفی ومختلف فیہ مسئلہ نہیں رہا۔

یزید میری نگاہ میں

واقعہ ہائلہ کربلا کے یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کے عہد خلافت میں واقع ہونے کی وجہ سے یزید جس قدر بدنام ہے شاید ہی تاریخ اسلام کی کوئی شخصیت مسلمانوں میں مطعون ہو،

یہاں تک کہ عوام نفرت سے اپنے بچوں کا یہ نام بھی رکھنا پسند نہیں کرتے، حالانکہ جرائم ومعاصی کا تعلق نام سے نہیں، اخلاق وکردار سے ہے، ہوسکتا ہے کہ اچھے سے اچھے اور مبارک سے مبارک نام کا انسان مجرم عادی اور مرتکب اعمال شنیعہ ہو۔ تو کیا اس کے سیئات ومعاصی کی بنا پر وہ نام غیر مسعود ونامبارک ہوجائے گا، عہد سلف میں یزید نام کے بہت سے ائمہ فن گذرے ہیں جو وقت کے مقتدیٰ اور مرشد تھے، اور ہزاروں اور لاکھوں مسلمان ان کے عقیدت مند تھے۔

اس حادثہ کے افسوس ناک اور ماتم خیز ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہماری ایماندارانہ رائے ہے کہ یہ اور قسم کے دوسرے تاریخی حوادث وواقعات کو عقیدہ وایمان کی بنا نہیں قرار دیا جاسکتا، یزید پر اس واقعہ کی ذمہ داری کہاں تک عائد ہوتی ہے ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے اور اس کا فیصلہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ واقعہ شہادت کربلا پر اب تک جو مستند کتابیں اردو میں شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یزید پر جتنی ذمہ داری عائد کردی گئی ہے اُتنا وہ ذمہ دار نہیں ہے، یزید بہر حال مسلمان ابن مسلمان تھا، دنیائے اسلام کا متفق علیہ خلیفہ تھا، بڑے بڑے اجلّہ صحابہؓ نے جو اس وقت مکہ ومدینہ، کوفہ وبصرہ، شام، یمن اور دوسرے اسلامی مرکزوں میں موجود تھے خواہ بطوع رضا یا بالجبر واکراہ اس کی بیعت کرلی تھی، اس کی ولیعہدی کے معاملہ سے گو لوگوں کو اختلاف رہا ہو لیکن اس کی خلافت پر حضرت معاویہؓ کے انتقال کے بعد تمام مسلمانوں کا اجماع ہوگیا تھا، حضرت امام حسینؓ کی مظلومیت وحقانیت، صداقت پرستی مُسلّم، لیکن یزید کو ابولہب وابوجہل جیسے اعدائے اسلام اور دشمنانِ رسول کی صف میں شامل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ فریقین بہر حال مسلمان تھے، اور اس پر اسی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی چاہئے، اس سے مقصود خدانخواستہ قاتلانِ حسینؓ کی حمایت نہیں ہے، ہمارے نزدیک نواسۂ رسول کا قتل دنیا کا سب سے بڑا اندوہناک اور غم انگیز حادثہ ہے اور ابن سعد، شمر، ذی الجوشن، ابن زیاد اور دوسرے شرکائے قتل کی بہیمیت درندگی، سبعیت اور سنگ دلی پر جتنی نفریں کی جائے کم ہے، لیکن جوش عناد میں صحیح تاریخی واقعات کو مسخ کردینا کچھ کم ناروا حرکت اور قابل نفریں فعل نہیں ہے جس سے ہر مسلمان کو پرہیز کرنا چاہئے، حضرت زین العابدین جو تاریخ میں باہش ودہر کے مرتبوں میں "عابد بیمار" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور اس لٹے ہوئے قافلہ کی جو فرات

کے کنارے خیمہ زن تھا اور جس نے شامیوں کی دل بادل فوج کا مقابلہ کیا تھا تنہا یادگار ہیں۔ ان سے بڑھ کر یزید کا کوئی مخالف اور دشمن نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے عام وقائع نگاروں کے خلاف یزید کے حسن سلوک، قدر افزائی اور پردہ نشینان حرم حسینؓ کی منزلت شناسی کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ حسب ذیل روایات غالباً حضرت زین العابدین ہی سے مروی ہیں جن کو ہم دارالمصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ کی ساتویں جلد سے جو امام حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیر اور حضرت امیر معاویہؓ کے حالات پر مشتمل ہے، نقل کرتے ہیں، اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اصل واقعات میں کہاں تک تحریف کی گئی ہے۔ اور ذاکروں اور اردو مرثیہ نگاروں نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

جب زحر بن قیس قاصدِ ابن زیاد شہید دشت کربلا حضرت حسینؓ کا خاک و خون آلودہ سر مبارک یزید کے پاس لایا تو یزید کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اور کہنے لگا کہ:

''حسین کو نہ قتل کرتے تو بھی تمہاری اطاعت سے خوش ہوسکتا تھا۔ ابن زیاد پر خدا کی لعنت، واللہ اگر میں وہاں ہوتا تو حسین سے ضرور درگذر کرتا، خدا حسین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔''

قاصد متوقع انعام واکرام سے بھی محروم رہا۔

قاسم غلام یزید کا بیان ہے کہ جب حضرت حسینؓ اور اہل بیت کے دوسرے شہدا کے سرہائے مبارک یزید کے سامنے رکھے گئے تو ایک پر درد شعر پڑھا اور کہا:

''واللہ اے حسینؓ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو تمہیں ہرگز قتل نہ کرتا۔''

جب یہ محترم قافلہ یزید کے دروازہ پر پہنچا تو محضر بن ثعلبہ چلایا:

''میں امیر المومنین کے پاس فاجر کمینوں کو لایا ہوں'' تو یزید نے غضب آلود ہو کر کہا:

''محضر کی ماں سے زیادہ کمینہ اور شریر بچہ کبھی کسی عورت نے نہیں پیدا کیا۔''

حسینؓ کے تمام مدعیوں کو حضرت سجاد کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کرنی چاہئے، ہمارے شیعہ دوست اس معاملہ میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں، انھوں نے اس واقعہ کو نہ صرف عقیدہ و ایمان کی

بناء قرار دیا ہے بلکہ کفر واسلام کا فیصلہ بھی یزید کی مخالفت وموافقت پر رکھا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ اعتقادی نہیں یکسر تاریخی ہے۔ اگر اس حادثہ فاجعہ کے تمام متعلقات وجزئیات کو ان کی اصلی جگہ پر رکھا جائے تو صدہا سال کی بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک کفر واسلام کی بنیاد کسی شخص کی حمایت ومخالفت پر نہیں ہو سکتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

پروفیسر اجمل خاں غبار خاطر کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام کی زندگی مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ بیک وقت مصنف بھی تھے اور مقرر بھی، فلسفی بھی تھے اور ادیب بھی، مدبر بھی تھے اور سیاسی جدوجہد کے میدان کے سپہ سالار بھی، اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے تعلقات وروابط کا دائرہ کسی ایک گوشۂ زندگی تک محدود نہیں تھا، علوم دینیہ کے حجروں کے زاویہ نشین، ادب وشعر کی محفلوں کے بزم طراز، علم وفلسفہ کی کاوشوں کے دقیقہ سنج ایوان سیاست کے مدبر اور معرکہ آرائیوں اور نبرد آزمائیوں کے شہ سوار سب کے لئے ان کی شخصیت پرکشش تھی اور سب بقدر حوصلہ وظرف اس مجمع فضل وکمال اور مرکز علم ودانش کے افادات عالیہ سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید ند و در تو پیوستند''

البتہ ان کے ارادت مندوں اور ان سے حسنِ عقیدت رکھنے والوں کا دائرہ جس قدر وسیع اور بین الاقوامی تھا اتنا ہی ان کے مخلصوں، محبتوں اور دوستوں کا دائرہ تنگ تھا۔

ایسے خوش قسمت اصحاب جنہیں مولانا اپنے دوستوں میں تصور اور شمار کرتے تھے وہ خال خال تھے اور صرف وہی تھے جن سے علم وذوق کے اشتراک اور مزاج وطبیعت کی مناسبت نے انہیں وابستہ کر دیا تھا، ایسے ہی خال خال حضرات میں جہاں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی بھی تھے، جن کو مولانا کا شرف مخاطبت حاصل تھا اور مستقلا باہم مراسلت ومکاتبت قائم تھی جس کی مدت مولانا دریابادی کے زمانہ طالب علمی سے لے کر فروری ۱۹۵۷ء تک ہے، یعنی مولانا کی وفات تک مولانا دریابادی نے ان منسات عالیہ کو حرز جان بنا کر رکھا تھا اور اب تو اُسی گنج مخفی کو ''نیا دور'' لکھنؤ کے ایک اسپشل نمبر کے ذریعہ ۱۹۵۹ء میں وقف عام کر دیا ہے۔ جس سے مولانا کے مکتوب الیہ سے وسیع علائق وروابط کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا اپنے اور دوستوں اور مخلصوں کی طرح ان کو بھی صدیقی العزیز، صدیقی الاعز سے مخاطب کرتے تھے جو ان کے غایت محبت کی دلیل ہے جس کے معنی ہیں ''اے میرے پیارے دوست'' یہ صدیق بدال مشدودہ نہیں جس کے معنی سچے اور راست باز کے ہیں بلکہ بفتح صاد وبکسر دال بروزن فعیل وکریم ہے جس کے معنی دوست کے ہیں، اور اردو میں بہت کم مستعمل ہے اور خیال آتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کے علاوہ اور کسی خط نگار نے استعمال نہیں کیا ہے، کسی خط میں حبیبی فی اللہ اور کسی خط میں صرف صدیقی بھی لکھا ہے۔

خطوں کی اصل تعداد تو معلوم نہیں کتنی رہی ہوگی لیکن ان میں جتنے محفوظ رہ گئے ان کی تعداد کل ۱۹ ہے۔ پہلا خط اس وقت کا ہے جب مولانا عبدالماجد بی اے پاس کر کے فلسفہ لے کر ایم اے میں داخلہ کی فکر کر رہے تھے جو اس وقت کسی مسلمان طالب علم کے لئے ایک نئی بات تھی اور الہلال کو نکلے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا تھا، لیکن ہر شخص کی زبان پر اسی کا چرچا اور سارا ملک اُسی کے آوازۂ شہرت سے گونج رہا تھا، علی گڑھ کے خلاف اس میں بڑے سخت مضامین نکل رہے تھے جس سے مولانا دریابادی متفق نہیں تھے، مولانا شبلی بھی علی گڑھ کی سیاسیات کے بہت مخالف تھے لیکن الہلال اس میں ان سے کہیں آگے بڑھ گیا تھا، مولانا عبدالماجد ابھی طالب علم تھے، انھوں نے

ہمت کر کے علی گڑھ سے متعلق الہلال کی شدید اور تند پالیسی کے خلاف مولانا کو خط لکھا لیکن مولانا نے اس کو برا نہیں مانا اور فوراً جواب دیا جس کا لب ولہجہ خلاف توقع بڑا نرم اور شیریں مساویانہ تھا لکھتے ہیں:

"اس مخلصانہ اظہار رائے ومشورہ کے لئے آپ کا متشکر اور ممنون ہوں۔ میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنے معروضات عرض کرتا لیکن میں خود بھی بیمار ہوں اور گھر میں بھی سخت علالت سے دوچار۔ انشاء اللہ پھر لکھوں گا، مجھے آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا، مولانا شبلی سے جو یہیں موجود تھے، پتہ پوچھ کر خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، الہلال کے لب ولہجہ کی نسبت مولانا شبلی کی بھی وہی رائے ہے، جو آپ کی ہے۔"

مولانا کا مرتبہ اس وقت بھی مولانا دریابادی سے کچھ بلند ہی تھا، یہ ان کا بڑا کرم تھا کہ ایک طالب علم سے مساویانہ لب ولہجہ اختیار کیا۔

دوسرا خط اس وقت کا ہے جب مولانا دریابادی لکھنؤ چھوڑ کر فلسفہ میں ایم اے کرنے کے لئے علی گڑھ پہنچ گئے تھے اور وہاں پروفیسر ہارویز جرمن یہودی مستشرق سے جرمن زبان میں کچھ شد بد شروع کر دی تھی، مگر وہ شُد بُد سے آگے نہ بڑھ سکی، اور مولانا جرمن پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے۔

تیسرا خط اس وقت کا ہے جب مولانا اپنی مشہور روزگار کتاب "فلسفۂ جذبات" لکھ کر فارغ ہو گئے تھے اور اسی کتاب کا ایک باب دو نمبروں میں چھپنے کے لئے الہلال میں بھیجا تھا لکھتے ہیں۔

دیر آمدی اے نگارِ سرمست — زودت نہ ہم دامن از دست

الہلال نے اس مضمون کو دو نمبروں میں چھاپا لیکن اس کی بعض مصطلحات پر سخت تنقید کے ساتھ جس کا لب ولہجہ مولانا کے محبت آمیز خط کے لہجہ سے بالکل مختلف تھا۔ الہلال کے تنقیدی نوٹ کے جواب میں مولانا نے بھی ایک مضمون ترکی بہ ترکی لکھا تھا جس کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:

"آپ کے غصہ نے بڑا لطف دیا"

چھٹا خط اس وقت کا ہے جب کہ مولانا رانچی میں نظر بند تھے، پہلی جنگ عظیم جاری تھی،

۱۳ء میں جو تلخ و تند مباحثہ الہلال کے صفحات میں فلسفہ جذبات کی بعض اصطلاحات کے سلسلہ میں ہو گیا تھا، اس پر مولانا دریابادی کو ندامت اور تاسف تھا اور رانچی خط لکھ کر مولانا سے معذرت کی تھی، اس کے جواب میں مولانا نے جو شریفانہ انداز اختیار کیا اور لطف و نوازش کی جو بے پناہ بارش کی اس سے مولانا دریابادی پانی پانی ہو گئے، لکھتے ہیں:

''میں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں اور جو باعثِ نیاز مندی ہو سکتے ہیں جب تک ان میں تغیر نہ آئے میری نیاز مندی متغیر نہیں ہو سکتی۔

برہمن عشق ز کونین صلح کرد ہمہ تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن

آخری خط اس وقت کا ہے جب ملک کو آزاد ہوئے قریب قریب ایک برس ہو گیا تھا اور مولانا قومی حکومت میں وزیر تعلیمات تھے، ان سے ندوہ یا دارالمصنفین یا کسی اور ادارہ کی امداد کی مولانا دریابادی نے تحریک کی تھی تو مولانا ان کو لکھتے ہیں:

''صدیقی! خط مورخہ ۱۷ مئی ۴۹ء پہنچا جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا وہ پیش نظر ہے، ہر بات اپنے مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے اور انشاء اللہ انجام پائے گی۔''

اس کے بعد مولانا دریابادی صاحب کو خطوط لکھتے رہے جن کی تعداد ۳۰ ہے، لیکن وہ مولانا کے دست و قلم کے نہیں مولانا کی طرف سے ان کے سکریٹری جناب اجمل خاں کے ہاتھ کے اردو میں لکھے ہوئے یا انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے ہیں لیکن وہ پبلک کے کام کے نہیں ہیں اور پھر ان میں کوئی ادبی لطف بھی نہیں ہے۔

مولانا الہلال کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین کے بھی منتظر رہا کرتے تھے انھوں نے الہلال کے ساتھ ''البصائر'' نکالا تو رقم طراز ہیں:

''البصائر جولائی سے شائع ہو جائے گا، اس کے لئے کوئی مضمون مخصوص ارقام فرمائیں، کسی اہم علمی موضوع پر ہو، ترجمہ ہو یا بطور خود مضمون ۱۵ ر جون تک ضرور مل جانا چاہئے، پہلا نمبر مدت سے مرتب ہے صرف بعض ابواب باقی ہیں۔''

مولانا رانچی میں نظر بند اور حکومت کے معتوب تھے، اسی حالت میں مولانا دریابادی نے

ان کو خط لکھا تو مولانا لکھتے ہیں:

''آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ ہے، موجودہ حالات میں کہ نظر بند اور معتوب حکومت ہوں، آپ کے لئے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہو سکتی تھی، الا یہ کہ مخلصانہ و بے غرضانہ لطف ونوازش ومقتضائے خلق طبع اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون ومتشکر ہوں۔''

ایک خط میں جس پر ۲۶ر نومبر ۱۹۱۹ء کی تاریخ پڑی ہے، لکھتے ہیں:

''آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں گذر گئیں۔''

مولانا کی مشہور کتاب ''تذکرہ'' نئی نئی شائع ہوئی تھی، ملک میں اس کا بڑا غلغلہ تھا، ہر بزم ہر مجلس اور ہر صحبت میں اسی کا ذکر مذکور، مکتوب الیہ کو حسن اتفاق سے کہیں ہاتھ آگئی اور اس پر اپنی رائے لکھ بھیجی تو لکھتے ہیں:

''مدت کے بعد آپ کا خط آیا، خوش وقت فرمایا۔ ''تذکرہ'' کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی۔ ایک صاحب نے بطور خود شائع کر دیا، بوجوہ اس کی اشاعت میرے لئے خوش آئند ہوئی۔''

مولانا کو اپنی اس کتاب کے مقدمہ سے جس کو مسٹر فضل ابن احمد نے لکھا تھا، سخت اختلاف تھا، اس میں انھوں نے مولانا کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی تھیں جن کا مولانا نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا اور ان سے ڈاکٹر اقبال کو شکایت پیدا ہو گئی، اور انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اپنی آزردگی کا اظہار کیا تھا، مولانا اس سلسلہ میں سید صاحب کو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں، دراصل اس کمبخت تذکرہ کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں نہ صرف ڈاکٹر اقبال وغیرہ والا ٹکڑا بلکہ پورا مقدمہ طرز تحریر واستدلال کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے۔''

لکھنؤ سے مولانا دریابادی کی مخصوص نگرانی میں ''حقیقت'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکلنا شروع ہوا تھا جس کے چند پرچے ابھی شائع ہوئے تھے اس کی داد مولانا ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''آپ کے خط کے بعد خصوصیت سے میں نے دیکھا، بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا ویکلی اردو اخبار ہے، اگر استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاق عام کی پیروی نہ کی گئی تو ایک بڑی ضرورت پوری کرے گا۔''

اس ویکلی کے لئے مولانا نے ایک مضمون دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔

ایک زمانہ میں حجاز کے قبور وآثر کے انہدام کے سلسلہ میں ہندوستان میں بڑا خلفشار برپا ہوگیا تھا۔ خلافت کمیٹی میں دو گروپ ہو گئے تھے، ایک گروپ جس میں علی برادران اور حضرات فرنگی محل وغیرہ تھے، ابن سعود کا سخت مخالف تھا، ایک دوسرا جس میں مولانا ظفر علی خاں واہل حدیث جماعت کے حضرات تھے، اسی درجہ میں ان کا حامی وحمایتی تھا، اس مسئلہ پر لکھنؤ میں خلافت کمیٹی کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں شدید جنگ اور زور آزمائی کا خطرہ تھا اور وہ وفدِ خلافت جو مولانا سید سلیمان ندوی کی سرکردگی میں حجاز گیا تھا، واپس آگیا تھا اور اس کی رپورٹ شائع ہوگئی تھی، لیکن وہ متفقہ نہیں تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کو بعض جزئیات سے اختلاف تھا اور انھوں نے اپنا اختلافی نوٹ رپورٹ کے ساتھ منسلک کر دیا تھا، مولانا لکھنؤ میں عموماً صفی الدولہ حسام الملک نواب علی حسن خاں مرحوم کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے، اب کی مرتبہ بھی انہیں کے یہاں قیام کا ارادہ تھا، لیکن مولانا دریابادی نے اپنے یہاں ٹھہرانے کے لئے ان کو لکھا تو لکھتے ہیں:

''اگر آپ ٹھہرائیں تو میں آپ کے یہاں ٹھہروں۔''

ظاہر ہے کہ مولانا دریابادی کے لئے کتنے فخر کی بات تھی، اس سے مولانا دریابادی کے ساتھ مولانا کے شدید قلبی تعلق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کا ایک طویل خط ہے جس میں مولانا کے اصول زندگی کے بہت سے گوشوں پر خوب روشنی پڑتی ہے، مسئلہ توریث کے سلسلہ میں یوپی کے مسلمانوں میں بڑے شدید قسم کے مفاسد پیدا ہو گئے تھے جن کی طرف مولانا دریابادی نے ایک خط کے ذریعہ مولانا کو توجہ دلائی تھی، مولانا نے ان کو لکھا کہ:

''یہ اور اس طرح کے بے شمار مفاسد ہیں جن کی اصلاح مقدم ترین امور میں سے ہے

لیکن اس بارے میں سب سے پہلا سوال طریق اصلاح کا ہے جو بہت کم مصلحت وقت کے پیش نظر رہتا ہے اور اسی وجہ سے کامیابی نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ کسی جماعت کے رسوم وعوائد اور صدیوں کی مالوفات ومحبوبات میں تبدیلی پیدا کرنا محض بحث ونظر سے نہیں ہوسکتا، نہ محض دلائل ومعلومات کی اشاعت اس کے لئے سودمند ہوسکتی ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سعی اصلاح کے ساتھ مفاسد کے دواعی وترغیبات کے رفع وانسداد کی بھی کوشش کی جائے، مجرد ترک وضع مفاسد کی دعوت مفید نہیں ہوسکتی، مثلاً اگر آپ لوگوں سے کہیں کہ گرد وغبار سے بچو تو اس وعظ کے ساتھ سڑکوں اور راستوں پر پانی کے چھڑکاؤ کا بھی آپ کو انتظام کرنا ہوگا، مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اصلاح مفاسد کا علم لے کر اٹھیں وہ پہلے خود عمل کا پیکر بن جائیں اور مفسدہ پیدا کرنے والے محرکات واسباب ودواعی کے ازالہ کی کوشش کریں، یہ دور ہوجائیں گے تو مفسدہ آپ سے آپ ختم ہوجائے گا، ہوتا یہ ہے کہ لوگ مفاسد کی اصلاح کے لئے کھڑے تو ہوجاتے ہیں اور ان کے خلاف اس زور شور سے وعظ کہتے ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اور سمجھتے ہیں کہ مجرد وعظ وپند ار اور تقریر وتحریر سے اصلاح ہوجائے گی لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ نہیں ہوتی اور کسی قیمت پر لوگ اپنے مالوفات ومحبوبات ودعویات کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔"

مولانا کے مکتوب کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) کسی مفسدہ کی اصلاح سے پہلے طریق اصلاح پر غور کرلینا ضروری ہے، یہ جتنا ہی موثر اور موصل الی الاصلاح ہوگا اتنا ہی کامیابی کا اِمکان زیادہ ہوگا۔

(۲) مصلح کے لئے ضروری ہے کہ اصلاح کا علم اٹھانے سے پہلے خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے اور داعیات وبواعث ومفاسد کا پوری عزیمت کے ساتھ مقابلہ کرے۔

(۳) معاشرتی مفاسد میں بڑا حصہ غیر شرعی رسوم واعمال کا ہے جو شرعاً بھی داخل فسق ومعاصی ہیں، ان کی اصلاح کے لئے انہی کو عمل کا پیکر بن کر آگے بڑھنا چاہئے۔

(۴) ایسی جماعت کو منظرِ عام پر آجانا چاہئے جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج میں خود مجسم و ممثل ہو کر دکھلا دے۔

(۵) چند باعزیمت انسانوں کا فعل، اخبارات کے سینکڑوں آرٹیکلوں سے کہیں زیادہ اثر رکھتا ہے۔

(۶) اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تغیر کی چند ممتاز خصوصیتوں کے ساتھ قائم ہو جائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی جن میں احساسِ حال اور طلبِ اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

(۷) آپ تصنیف و تالیف میں علم کو اور سعی و عمل میں خوشروی کو مقدم رکھئے۔

عملی اصلاح کی صورت یہ ہے کہ اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزمِ صادق رکھنے والے اشخاص کو منتخب کر کے ایک انجمن کی تشکیل کیجئے اور اس میں ایسے لوگوں کو شریک کیجئے جو تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

میں اخبارات میں مضامین لکھنے کا مخالف نہیں ہوں، وہ ضرور لکھے جائیں مگر عمل ہر حالت میں مقدم ہے اور قوم کی اصلاح خود عمل کرنے ہی سے ہوسکتی ہے۔

میں حاجی بغلول اور تجاہل عامیانہ وغیرہ قسم کے لٹریچر کو بالکل پسند نہیں کرتا، اس قسم کے حکایات بالکل وقتی ہوتے ہیں، دائمی نہیں ہوتے وہ چیزیں اختیار کیجئے جو دائمی ہوں اور آپ کے مرنے کے بعد بھی یاد رکھی جائیں اور اسی کے ساتھ لوگوں کے دِل میں آپ کی یاد بھی باقی رہے۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

سیرتِ نبویؐ
قرآن کی روشنی میں

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی تحریک پر مدراس میں وہاں کی انجمن اسلامیہ کے تحت قرآن کی روشنی میں سیرت نبویؐ پر جو لکچر دیے تھے وہ موضوع کی جدت، ندرت، اہمیت کے پیش نظر اہل علم کے طبقہ میں بہت پسند کیے گئے، مولانا نے مزید اضافوں کے ساتھ اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں بھی ان کو افادۂ عام کے خیال سے باقساط شائع فرمایا تھا۔

سیرت نبویؐ پر اب تک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں یا لکھی جا چکی ہیں وہ سب کی سب بلا استثناء حدیث و سیر و مغازی کی کتابوں سے ماخوذ اور مستنبط ہیں ان میں مولانا سید سلیمان ندوی کی خطباتِ مدراس بھی ہے جس کا ماخذ بھی یہی کتابیں ہیں۔ ''نفس قرآن مجید کی روشنی میں سیرت نبویؐ'' تالیف کرنے کا خیال اس سے پہلے کسی کو نہیں پیدا ہوا، مولانا شبلی جس زمانہ میں سیرت نبوی لکھ رہے تھے، مولانا ابوالکلام کو یکایک اس کا خیال پیدا ہوا، اور انھوں نے مولانا شبلی سے اس کا تذکرہ کیا اور عرض کیا کہ آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قائم کیجئے ''قرآن اور سیرت محمدیہ'' اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلایئے، کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت معلوم ہو سکتی ہے، مولانا نے اس خیال پر بڑی پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں دستیاب ہو سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے لیکن جب مولانا ابوالکلام نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا اچھا تم

یہ ٹکڑا مرتب کردو تو سیرت کے ساتھ اس کو بھی شامل کردیا جائے گا۔ بات آئی گئی ہوگئی، ایک عرصہ کے بعد دہلی میں مولانا شبلی سے پھران کی ملاقات ہوئی تو مولانا شبلی نے ان سے فرمایا کہ آپ نے اس وقت سیرت کے متعلق جو تجویز پیش کی تھی اس کا اب مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے اور یہ یقیناً بہت اہم چیز ہوگی۔

یہ مولانا شبلی سے مولانا ابوالکلام کی آخری ملاقات تھی اس کے بعد مولانا کئی سال زندہ رہے لیکن اس درمیان میں مولانا ابوالکلام کا ان سے ملاقات کا کہیں اتفاق نہیں ہوا، مولانا کو ۱۹۱۴ء میں اپنے مرض الموت میں جو لوگ یاد آئے اور اپنی سیرت کی تکمیل کے لئے جن تین آدمیوں پر ان کی نگاہ پڑی ان میں ایک مولانا ابوالکلام بھی تھے، جن کی مافوق العادۃ صلاحیتوں اور قرآنی بصیرت ومطالعہ سے بہت متاثر تھے، ان کو کلکتہ کے پتہ سے تار دیا گیا تو سوئے اتفاق ان کو نہیں مل سکا اور وہ اِن کی ہزار خواہش وآرزو کے باوجود اعظم گڑھ نہیں پہنچ سکے اور مولانا کی ملاقات سے محروم رہ گئے، کیا عجب تھا کہ سیرت کی تکمیل میں جو مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ ان کو بھی شریک ہونے کی وصیت فرماتے اور قرآن کی روشنی میں ان کی ہدایت پر وہ جو باب لکھتے سیرت میں شامل کرلیا جاتا۔ بہر حال مولانا سے دہلی میں اپنی آخری ملاقات کے بعد ایک باب ہی نہیں بلکہ مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ ومستنبط شروع کردی جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا، نئے نئے دروازے ان کے سامنے کھلتے گئے، اور ان کو امید وتوقع سے کہیں زیادہ اس میں کامیابی ہوئی اور کتاب مکمل ہوگئی تو ان کو بڑی خوشی ہوئی کہ جو چیز وقت کے مشہور ترین سیرت نگار کو ممکن العمل نظر نہیں آرہی تھی وہ ان کی تنہا کوشش اور قرآن کے وسیع مطالعہ سے ممکن العمل ہوگئی۔

مولانا نے اس کے مرتب اور مکمل ہوجانے کے بعد اس کا جائزہ لیا تو ان کو عجیب عالم نظر آیا، حیات وسیرت نبوی کا کوئی ضروری ٹکڑا اینا نہیں تھا جس کے لئے قرآن میں ایک سے زائد آیتیں نہ آگئی ہوں، اس کو دیکھ کر مولانا ابوالکلام کو اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ اگر خدانخواستہ دنیا سے تاریخ اسلام کی ساری کتابیں معدوم ہوجائیں اور سیرت نبوی سے متعلق وہ تمام سرمایہ علم جو آپ کی ولادت کے زمانہ یعنی چھٹی صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک آپؐ کے ظہور وبعثت

ودعوت توحید واسلام کی نسبت دنیا نے سنا اور جانا ہے اور صرف قرآن ہی دنیا میں باقی رہے، تو تنہا قرآن ہی سے حاملِ قرآن کی مقدس شخصیت، سیرت، وقائع وایام زندگی معلوم کئے جاسکتے ہیں اوراس وجود اقدسؐ کے متعلق دنیا جو باتیں جاننا چاہتی ہے یا جن باتوں کی اس کو ضرورت ہے وہ سب قرآن ہی سے معلوم کرسکتی ہے اوراس بارے میں قرآن اپنے سے باہر کا قطعاً محتاج نہیں یعنی حدیث وسیر ومغازی وتاریخ وجغرافیہ کی کتابوں اور سیاحوں کے سفرناموں کا۔

یہ کتاب مولانا کے کمال سے کہیں زیادہ مرتب ومکمل تو ضرور ہوئی ہوگی جیسا کہ انھوں نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں لکھا ہے لیکن ان کی پوری زندگی میں وقت کے اوراخبارات ورسائل تو الگ رہے خود ان کے اخبارات الہلال، البلاغ واقدام میں کبھی اس کا ذکر آیا اور نہ اپنے اس اہم کام کی طرف جس کے لئے انھوں نے کتنی راتیں جاگ کر کاٹی ہوں گی اور کتنے دن قربان کئے ہوں گے، خود ان کا ذہن منتقل ہوا۔

میں نے ''الاعتصام'' لاہور کے ذریعہ ان کے اس بھولے بسرے کام کی طرف ان کے تذکرہ کے حوالہ سے توجہ دلائی تو اس کے چھ ہی مہینہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، نہیں کہا جاسکتا کہ ''الاعتصام'' کا وہ پرچہ ان کی نظر سے گذرا بھی یا نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی آج سے ۴۰، ۴۵ برس پہلے بلاکسی خارجی تحریک اور ایما کے ازخود قرآن حکیم کی روشنی میں سیرت نبوی لکھنے کا شوق بیدار ہوا، اور چاہا کہ قرآن مجید کو اسی نقطۂ نظر سے بالاستیعاب پڑھا جائے اوراس کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو سیرت نبوی کے تمام ابواب قرآن مجید کی ہی مدد سے لکھے جاسکتے ہیں، ایک مرتبہ ایک ممتاز صحابی نے حضرت عائشہؓ سے آپؐ کے متعلق کچھ حالات دریافت کئے تو فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے، اس میں تو صاف ہے۔

اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْم

لیکن کسی وجہ سے یہ خیال عمل میں نہیں آسکا، اور پھر وہ اپنے دوسرے علمی وادبی کارناموں کے انجام دینے میں لگ گئے، مدراس کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا

کی طرف سے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کرنولی نے اسلامیات کے کسی موضوع پر لکچر دینے کے لئے ان کو بلایا تو بے اختیار ان کا ذہن اپنے اس بھولے بسرے موضوع کی طرف منتقل ہو گیا اور انھوں نے اللہ کا نام لے کر اس پر تیاری شروع کردی، فرمائش تو درحقیقت چھ لکچروں کی تھی کہ وہ وقفہ وقفہ سے چھ دنوں میں اس انجمن کے تحت دیئے جائیں، لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی کے اور مشاغل علمیہ وادبیہ کے ساتھ جن میں سے ایک اپنے ذاتی ہفتہ وار اخبار ''صدق جدید'' کی ادارت کے فرائض بھی تھے جن کو وہ ترک نہیں کرسکتے تھے، یہ لکچر پانچ ہی کی تعداد میں تیار ہوسکے، اور انھوں نے انہی محدود لکچروں میں پوری سیرت قرآن کی روشنی میں مرتب کرڈالی اور مدراس جاکر اسی مذکورہ انجمن کے تحت ایک بڑے مجمع کے سامنے وقفہ وقفہ کے ساتھ دیدیے، اور بہت پسند کئے گئے، پہلے انھوں نے افادۂ عام کے خیال سے مزید اضافوں کے ساتھ ''صدق جدید'' میں شائع کیا اور ایک طویل انتظار کے بعد وہ کتابی صورت میں بھی آگئے، جس سے اب ہر شخص استفادہ کرسکتا ہے۔

اس کی قدروقیمت اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ یہ مقدس علمی اور دینی کارنامہ ایسے شخص نے انجام دیا ہے جو دیوبند، ندوہ، فرنگی محل، بریلی، رحمانیہ سلفیہ اثریہ کسی عربی ودینی درسگاہ کا فارغ التحصیل اور سند یافتہ عالم نہیں بلکہ کالج کا گریجویٹ ہے، دورانِ تعلیم جس کا خاص مضمون یا سبجکٹ فلسفہ رہا ہے اور فراغت تعلیم کے بعد بھی زمانہ دراز تک یہی اس کا موضوع سخن رہا اور اس پر بیش قیمت تصنیفات وتالیفات وتراجم ومضامین ومقالات ملک کے سامنے پیش کرتا رہا اور خراج تحسین حاصل کرتا رہا، اس دور کی مولانا دریابادی کی کتاب 'فلسفۂ جذبات' ہے جس نے تمام اہل علم کو ان کی طرف متوجہ کردیا اور ایک فلسفی کی حیثیت سے سارے ملک میں مشہور ہوگئے، اور وقت کے بڑے بڑے صاحب نظر لوگوں کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں۔

اسی کتاب کے دو ابواب کے بعض اصطلاحات پر جو انھوں نے خاص طور سے شائع کرنے کے لئے اخبار ''الہلال'' میں بھیجا تھا اور مولانا نے بڑے آب وتاب کے ساتھ الہلال کی دو اشاعتوں میں بڑے فخر وانبساط کے ساتھ شائع بھی کیا لیکن انہی دو بابوں کی بعض اصطلاحات کے بارے میں دونوں بزرگوں میں اختلاف ہوگیا، ایک حظ وکرب کو صحیح سمجھتا تھا اور ایک لذت والم

کو اور دونوں کو ہی اپنی اپنی اصطلاحات پر اصرار تھا، اس میں اردو زبان کے ان دونوں باکمالوں اور صاحب طرز انشاپردازوں نے جو اپنی اپنی اقلیم علم وادب کے جم وکے تھے خوب خوب دادسخنوری دی تھی، اور قارئین الہلال نے اس ادبی ولسانی مباحثہ ومناظرہ سے خوب لطف اٹھایا، اس میں مولانا ابوالکلام ہی کا پہلو غالب تھا، جس کے لئے بعد میں مولانا دریابادی نے رانچی جہاں وہ نظر بند تھے، خط لکھ کر مولانا سے معذرت کی اور مولانا نے اس کے جواب میں جو انداز اختیار کیا اور لطف ونوازش کی جو بارش کی اس سے مولانا دریابادی پانی پانی ہوگئے۔ مولانا نے لکھا:

''اولاً تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں، اگر خدانخواستہ ہوتی بھی تو آپ کبھی مجھ کو شکوہ سنج نہ پائیں گے۔

بہ یمن عشق ز کونین صلح کردیم
تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی اور اخلاص کے لئے آپ کا ممنون اور متشکر ہوں۔''

کالج میں مولانا کی ثانوی زبان عربی رہی ہے، اور انگریزی کے مقابلہ میں ثانوی زبانوں کی جو اہمیت ہوتی ہے اس کو سب جانتے ہیں، ان کی تدریس کی طرف ان زبانوں کے اساتذہ کو چنداں توجہ نہیں ہوتی، کالج کی تنہا تعلیم سے طلبہ میں ان کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا، لیکن مولانا دریابادی نے اپنے طور پر عربی زبان کو بہت ذوق وشوق سے پڑھا اور پھر فراغت تعلیم کے بعد اپنے ذاتی شوق ومطالعہ سے تمام مروجہ عربی ودینی علوم میں اتنا درک پیدا کرلیا اور ان کے فہم وتدبر پر اتنا قادر ہوگئے کہ وہ کسی بھی عربی ودینی درسگاہ کے فاضل سے کم نہ رہے لیکن جب فلسفہ میں ان کے آوازۂ شہرت سے ملک گونج رہا تھا اور ''فلسفہ جذبات'' جیسی کتابیں ان کے قلم سے نکل رہی تھیں کہ یکایک انھوں نے فلسفہ چھوڑ کر قرآن کو اپنا موضوع بنالیا اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کا ارادہ کرلیا جس کو دنیا نے حیرت کے ساتھ سنا کہ ایک فلسفی جو ایک زمانہ میں ملحد اور خدا ناشناس یا منکر خدا بھی رہ چکا ہے اور ایک انگریزی داں جس کو کسی عربی ودینی درسگاہ کی ہوا بھی نہیں لگی ہے، قرآن کے معانی ومطالب ومباحث اور اس کے

اسرار ورموز وغوامض پر کیسے قادر ہوسکتا ہے، لیکن دنیا نے دیکھا کہ اسی انگریزی داں اور اسی فلسفی نے علوم عربی ودینی میں کچھ تو کالج میں عربی کی شدبد اور زیادہ اپنے ذاتی مطالعہ سے اتنادرک پیدا کرلیا کہ دارالعلوم ندوہ نے ایک کانووکیشن منعقد کر کے ان کو عالم کی سند دی اور ان کا شمار اسلامیات کے مشاہیر علماء میں ہونے لگا، اور انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر پایہ تکمیل تک پہنچادی اردو تفسیر کا پہلا اڈیشن نہایت اہتمام سے تاج کمپنی لاہور نے چھاپا اور انگریزی ترجمہ اور تفسیر کہیں اور چھپی، یہ ان کا اتنا بڑا بلکہ محیر العقول کارنامہ ہے کہ اس پر ان کو جتنی داد دی جائے کم ہے، ان دونوں تفسیروں کو قدیم علماء نے بھی پسند کیا اور اس خدمت پر ان کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد قرآن کی روشنی میں حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت بھی ایک تقریب کے سلسلے میں مرتب کرڈالی۔ یہ بھی ان کا ایک عظیم علمی کارنامہ ہے۔

اس مختصر کتاب میں سیرت نبوی کا یہ پہلو قرآن کی روشنی میں آگیا ہے اور ساتھ ہی ان اعتراضات کے جوابات بھی آگئے ہیں جو یورپ کے مستشرقین ادعائے علم میں ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے رہتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جس موضوع پر پہلے سے کوئی سرمایہ نہ ہو اس پر پہلی مرتبہ لکھنے میں کچھ نہ کچھ خامیوں کا رہ جانا کچھ مستبعد نہیں ہے اور اس کا اعتراف خود فاضل مصنف کو بھی تھا، ''معارف'' کے لائق تبصرہ نگار نے اس پر مطبوعات جدیدہ کے ذیل میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً اخلاق نبوی، شمائل نبوی، عبادات نبوی، معاملات نبوی پر الگ الگ باب قائم کر کے قرآن مجید سے تمام متعلقہ آیات جمع کردی جائیں تو یہ کتاب اور زیادہ مکمل ہوجاتی۔

تاہم مولانا نے اپنے پانچ لکچروں میں بکثرت ترمیم واضافہ کے بعد جو ابواب قائم کئے ہیں ان سے مولانا کی دقیقہ رسی، نکتہ سنجی، وسعت نظر، وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے اور ان سے حضورؐ کی سیرت پاک پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے، وہ ابواب یہ ہیں (۱) سوانح وحالات (۲) فضائل، خصائص، مشاغل (۳) رسالت وبشریت (۴) ہجرت (۵) غزوات ومحاربات (۶)

معاصرین اس میں مکہ کے تمام مشرکین، یہود و نصاریٰ اور منافقین و مومنین سب آگئے ہیں (۷) معجزات و دلائل (۸) خانگی زندگی اور ازدواجی زندگی۔

اس موضوع پر مولانا دریابادی کے قلم سے جتنا کچھ بھی ہو گیا ہے وہ بہرحال قابل قدر ہے اور اس پر بڑی سے بڑی عمارت تیار ہوسکتی ہے، انھوں نے خود بھی اس کے طبع ثانی میں اس موضوع پر مصر کے تازہ ترین لٹریچر کی روشنی میں مزید اضافہ کا وعدہ فرمایا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر اس کتاب کے طبع و اشاعت کا بڑا انتظار تھا، اس کی مجھ کو خوش خبری ملی تو میں نے مولانا کو یہ عریضہ لکھ کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔

مخدوم مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سیرت قرآنی کے طبع کی بشارت ملی، خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان میں اپنے موضوع کے اعتبار سے آپ کی یہ منفرد کتاب خاص آپ کے اہتمام و نگرانی میں چھپ کر منظر عام پر آگئی اور قرآن سے ذوق رکھنے والوں کے ہاتھوں تک پہنچ گئی، آپ کی اس عظیم الشان قرآنی خدمت کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ میں نے اس مقدس کتاب کے تعارف کے طور پر کچھ ہفوات لکھ کر ہندوستان کے ایک مشہور روزنامہ میں بھیجے تھے، لیکن اس نے شائع نہیں کئے میں نے یاد دہانی بھی کی تو کوئی جواب نہیں آیا۔ امام اہلسنت مولانا عبدالشکور لکھنوی کا انتقال ہوا اور ان پر اخبار میں مضمون شائع ہوا تو اس سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اسی طرح کی قرآنی خدمت مولانا عبدالشکور لکھنوی نے بھی انجام دی ہے جو اپنے عقیدہ مسلک اور فکر کے اعتبار سے دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں شیعوں کے رد میں ان کی بہت ساری کتابیں نظر سے گذری ہیں ان کا ماہانہ رسالہ ''النجم'' بھی برابر مطالعہ میں آتا رہا لیکن قرآن کی روشنی میں انھوں نے ایک زمانہ میں جو سیرت نبوی لکھی ہے وہ ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، اگر انھوں نے قرآن کی روشنی میں سیرت نبوی لکھی ہے تو بلاشبہ ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے، تعجب ہے کہ اپنے ان لائق و فاضل معاصر کی اس عظیم خدمت کا نہ مولانا ابوالکلام آزاد کو علم ہوا نہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو اور نہ یہ سمجھئے کہ اس موضوع پر اردو میں لکھنے کی پہل انہی نے کی ہے، اس سے پہلے کسی اور نے نہیں لکھا، اس سے بڑھ کر تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے

محقق کو بھی مولانا عبدالشکور کی اس کاوش کا علم نہیں تھا۔

سیرت نبوی قرآنی

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''جس زمانہ میں مولانا شبلی سے سیرۃ نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ آپ اپنی زیر ترتیب سیرۃ نبوی میں ایک باب قرآن اور سیرۃ محمدیہ قرار دیجئے، اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کرکے دکھلائیے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام و حالات معلوم ہوسکتے ہیں، فرمایا کہ صرف قرآن سے اتنا مواد کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب کیا جاسکے، مولانا اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو میں نے خود اس پر کچھ وقت صرف کرنے کا ارادہ کرلیا، اور قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط ایک مستقل ''سیرۃ نبویہ'' کی تالیف شروع کردی، جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا نئے نئے دروازے کھلتے گئے اور امید سے کہیں زیادہ اس میں کامیابی ہوتی گئی، اگرچہ اس بارے میں آیات کا بڑا ذخیرہ ذہن میں پہلے سے متحضر تھا لیکن یہ بات تو کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں گذری تھی کہ پوری سیرۃ نبویہ صرف قرآن ہی سے مرتب ہوسکتی ہے، چنانچہ امید و گمان سے بھی دو چند سیرت مکمل ہوگئی، اور اس پر میں نے خدا کا شکرادا کیا۔

تمام بود بیک وقت گرچہ ما غافل　　　حکایتے کہ ہمہ ناتمام می گفتند

لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ کتاب ان کی گوناگوں سیاسی وملی وقومی سرگرمیوں کی وجہ سے جن سے ان کو زندگی کے آخر تک چھٹکارا نہ مل سکا، زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی اور پھر اس سے وہ ایسا غافل ہوئے کہ آخر زندگی میں ہر طرح کے فراغِ خاطر اور فرصت کے باوجود ان کو بھولے سے اس کا خیال نہ آیا اور پھر اسی کے ساتھ اس سے اہم تر اور مفید تر کام یعنی تفسیر ترجمان القرآن بھی جس کی تکمیل کی، ان کے علوم و معارف اور ادب وانشاء کے قدر دانوں کو بڑی تمنا تھی پوری نہ ہوسکی اور ناتمام رہ گئی، یہ ان کی زندگی کا اتنا بڑا المیہ ہے کہ جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی ایک زمانہ میں از خود قرآن حکیم کی روشنی میں سیرت نبوی لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا اور انھوں نے چاہا تھا کہ قرآن مجید کی اس نقطۂ نظر سے تلاوت کی جائے اور بالاستیعاب اس کا مطالعہ کیا جائے تو سیرت نبوی سے متعلق تمام ابواب قرآن مجید ہی سے لکھے جاسکتے ہیں لیکن یہ بات آئی گئی ہوگئی اور پھر وہ اپنے ذوق ومیلان طبع کے مطابق اپنے دوسرے علمی وادبی اور فلسفیانہ کارناموں کے انجام دینے میں لگ گئے اور پھر اس کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا مدراس کی مسلم ایجوکیشن ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کی طرف سے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے لکچر دینے کے لئے ان کو مدعو کیا تو بے اختیار ان کا ذہن اس بھولے بسرے موضوع کی طرف منتقل ہوگیا اور انھوں نے اللہ کا نام لے کر اس پر تیاری شروع کردی، فرمائش تو درحقیقت چھ لکچروں کی تھی جو وقفہ وقفہ کے ساتھ چھ دنوں میں اس انجمن کے تحت دیے جانے تھے لیکن مولانا عبدالماجد کے اور مشاغل علمیہ وادبیہ کی وجہ سے جن کو وہ ترک نہیں کرسکتے تھے، یہ لکچر پانچ ہی کی تعداد میں تیار ہوسکے اور انھوں نے ان ہی محدود لکچروں میں قرآن کی روشنی میں پوری سیرت مرتب کرڈالی اور پانچ لکچر مدراس جاکر دیے بھی جن کو وہاں کے لوگوں نے بہت دلچسپی اور شوق سے سنا پھر انھوں نے ان لکچروں کو افادۂ عام کے خیال سے مزید اضافوں کے ساتھ بعد میں ''صدق جدید'' میں بھی باقساط شائع کیا لیکن اس انجمن کے تحت دیے گئے اور لکچروں کی طرح بڑا مسئلہ کتابی شکل میں ان کی طباعت کا تھا، جس کا قدردانوں کو برسوں انتظار کرنا پڑا جب اس کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا تو خود مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے اہتمام میں چھوٹی تقطیع پر چھپوا کر شائع کردیا اس طرح سے بڑے صبر آزما انتظار کے بعد قدردانوں تک پہنچی، اور اہل علم نے مولانا کی اس کاوش کو بہت سراہا کہ جو کام مولانا شبلیؒ جیسے وسیع النظر وسیع المطالعہ قرآنی علوم ومعارف کے عالم ومحقق اور اپنے وقت کے سیر وتاریخ ومغازی کے بے مثال امام کو مشکل نظر آیا اور اس پر آمادہ نہ ہوسکے اور مولانا ابوالکلام نے ان سے مایوس ہوکر ہمت کرکے کیا بھی تو وہ ان کی غفلت سے منظر عام پر نہ آسکا، اس کو مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے دیا، اس کے لئے اہل علم کی طرف سے ان کو جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے کم ہے اور اس کے ساتھ ساتھ

حیرت انگیز طور پر اپنی تفسیر ماجدی اردو و انگریزی میں بھی مکمل کردی، یہ بھی قدر دانوں تک پہنچ گئی۔

اس کی قدر و عظمت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ مقدس و دینی کارنامہ ایسے شخص نے انجام دیا ہے جو دیوبند، ندوہ، فرنگی محل، رحمانیہ کسی بھی عربی و دینی درسگاہ کا فارغ التحصیل عالم نہیں بلکہ کالج کا گریجویٹ ہے اور جس کا خاص مضمون کالج میں فلسفہ رہا ہے اور فراغت تعلیم کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اس کا موضوع سخن یہی تھا، اور اسی پر بیش قیمت تصنیفات و تالیفات و تراجم و مضامین مسلسل پیش کرتا رہا اور سارے ملک سے انہی اعلیٰ فلسفیانہ تصنیفات پر خراج تحسین حاصل کرتا رہا اور ساری دنیا بھی اس کو محض فلسفی ہی سمجھتی رہی اس دور کی ان کی سب سے بہتر کتاب ''فلسفہ جذبات'' ہے جس کے شائع ہوتے ہی سارے ملک میں دھوم مچ گئی تھی، جس کو انھوں نے فرطِ تقشف کی بنا پر جو بعد میں ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا اور قرآن کی خدمت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، ہمیشہ کے لئے اپنی تصنیفات سے خارج کردیا ہے اس کی بعض اصطلاحات پر مولانا ابوالکلام آزاد اور ان میں الہلال کے صفحات میں قلمی جنگ ہوئی تھی، ماجد میاں کو اصرار تھا کہ انگریزی اصطلاحات کے لئے بہترین لفظ ''حظ و کرب'' ہے اور مولانا نے ان کی جگہ لذت والم کو بہتر سمجھا اور اس کو بہت بعد میں جب کہ مولانا رانچی میں نظر بند تھے ماجد میاں نے بھی تسلیم کرلیا جو ان کی بڑائی کی دلیل ہے، اس ناگوار بحث کے سلسلے میں دونوں بزرگوں میں ذرا سی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی جو بحمد اللہ دور ہوگئی۔

افسوس کہ یہ خادم قرآن جس کا ایک ایک نفس قرآن کی خدمت کے لئے وقف تھا اور جو اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک قرآن کی خدمت اور اپنی انگریزی و اردو ''تفسیر ماجدی'' پر ان کے دوسرے اڈیشن کے لئے نظر ثانی اور نئی تحقیقات کی روشنی میں اضافہ کرتا رہا، ۶ رجنوری ۱۹۷۷ء کو اللہ کو پیارا ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس کی اس خدمت قرآنی کو قبول فرمائے اور اس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور اس کے ورثاء کو اس سلسلہ فیض کو قائم رکھنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

☆☆☆

سیرتِ نبوی قرآنی پر چھ لکچرز

مدراس میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا

(Muslim educational Association of southern India)

کے نام سے مسلمانوں کی ایک تعلیمی انجمن قائم تھی اس نے اپنے پروگرام میں ہر سال دینی خطبات کا ایک سلسلہ بھی رکھا تھا اس کے لئے اس نے سب سے پہلے اردو زبان کے مشہور سیرت نگار مولانا سید سلیمان ندویؒ کو مدعو کیا تھا اور ان کے ذوق کی مناسبت سے موضوع ''سیرت'' رکھا تھا، انھوں نے وہاں پہنچ کر سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر ۸ خطبے دیئے تھے، یہی خطبات ہیں جو ''خطبات مدراس'' کے نام سے بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئے وہ سید صاحب کا ایک اہم اور یادگار کارنامہ تھا، دوسری مرتبہ علامہ اقبال کو مدعو کیا گیا ان کے خطبات کا موضوع ''اسلام'' تھا وہ بھی بعد میں Reconstruction of religious thought in Islam کے نام سے ۱۹۳۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوگئے، وہ اسلامیات پر انگریزی میں بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے، مگر ہمارے سید صاحب کو ان خطبوں کے بعض حصوں سے اختلاف تھا، بمبئی کرانکل کے مشہور روزگار اڈیٹر اور قرآن کے انگریزی مترجم ''مارماڈیوک پکتھال'' کو بھی ایک سال بلایا گیا تھا اس کے بعد بدقسمتی سے فنڈ کی کمی اور دوسرے اسباب سے اس کا سلسلہ ختم ہوگیا، بہت عرصہ کے بعد افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کو اس کا پھر خیال آیا اور انھوں نے اس کے لئے فنڈ وغیرہ اکٹھا کیا اس مرتبہ ان کی نگہِ انتخاب اردو کے مشہور صاحب طرز انشاء پرداز اور اسلامیات کے فاضل فلسفہ کے متعدد کتابوں کے مصنف قرآن مجید کے مترجم ومفسر ''صدق جدید'' کے اڈیٹر مولانا عبدالماجد

دریابادی پر پڑی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، انھوں نے بصد معذرت اس خدمت کو قبول کرلیا، موضوع کا فیصلہ موصوف ہی پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی صواب دید سے جو علمی ودینی موضوع چاہیں اختیار کرلیں۔

مولانا ابوالکلام کی طرح مولانا دریابادی کو بھی آج سے ۳۰-۳۲ برس پہلے خیال پیدا ہوا تھا کہ سیرۃ نبویؐ پر ایک کتاب قرآن مجید ہی سے اخذ کرکے مکمل کی جائے، یوں تو اردو میں سیرت پر ایک سے ایک بڑھ کر کتابیں ہیں ان میں مولانا شبلی کی ''سیرۃ النبی'' قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی ''رحمۃ للعالمین'' اور مولانا عبدالرؤف داناپوری کی ''اصح السیر'' کو خاص امتیاز حاصل ہے، لیکن ان سب کا ماخذ حدیث وسیر ومغازی کی کتابیں ہیں، نفسِ قرآن مجید کی روشنی میں سیرت مرتب کرنے کی آج تک کوشش نہیں کی گئی لیکن مولانا کا خیال تھا کہ قرآن مجید اس نقطۂ نظر سے باربار پڑھا جائے تو سیرۃ نبویؐ کے اکثر مباحث قرآن مجید ہی سے اخذ واستنباط کئے جاسکتے ہیں لیکن یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا جب ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے لکچر کے لئے دعوت دی تو بے اختیار ان کا ذہن اس بھولے بسرے موضوع کی طرف منتقل ہوگیا اور انھوں نے اللہ کا نام لے کر اس موضوع کو اختیار کیا اور قرآن مجید کی تلاوت، اس کا مطالعہ، سیرت کے نقطہ نظر سے شروع کردیا، فرمائش تو درحقیقت چھ لکچروں کی تھی لیکن ہزار کوشش وسعی کے بعد تیار ہوسکے تو پانچ ہی کہ اور مشاغل جاریہ کے ساتھ جن میں ہفتہ وار ''صدق جدید'' کی ادارت کے فرائض بھی تھے اگر چھ تیار نہیں ہوسکے تو پانچ ہی وقفہ وقفہ کے ساتھ پڑھے گئے اور عام طور سے بہت پسند کئے گئے ان کے انگریزی ترجمے بھی مدراس کے انگریزی اخبارات میں چھپے اور غیر مذہب کے لوگوں نے بھی ان کو دلچسپی اور شوق سے پڑھا، اس کے بعد تو خود اس کے محرک ڈاکٹر عبدالحق کا ایکا یک انتقال ہوگیا اور یہ سلسلہ فیض ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا مگر جو لوگ بھی اس کے لئے منتخب کئے گئے، وہ اسلامی ہندوستان کیا عالم اسلام کی متفق علیہ عظیم شخصیتیں تھیں جن پر عالم اسلام کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

☆☆☆

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

قلعہ احمد نگر جیل سے رہائی کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کو کہیں اتفاق سے مولانا ابوالکلام کی تصویر نظر آگئی، تصویر دیکھی اور تمام پچھلی یادیں تازہ ہوگئیں، ایک ایک کو یاد کررہے ہیں اور مزے لے رہے ہیں جو کبھی ان کو لکھنؤ کے باغ و بہار میں کشیدہ قامت، خوش رو، نوجوان نظر آیا تھا، سیاہ شیروانی اور سیاہ ٹوپی میں ملبوس، سگریٹ آج بھی کل کی طرح رفیق، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، چہرہ پر متانت برستی ہوئی آہ! تصویر میں اس وقت ان کو اس حالت میں نظر آیا کہ تھکا ہوا چہرہ، چہرہ پر ضعیفی کے آثار، آنکھوں پر عینک، بال سیاہ سے زائد سفید، ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ، جسم آرام کرسی سے لگا ہوا پشت اور گردن کرسی کے تکیہ کا سہارا لئے ہوئے گویا سپاہی میدان جنگ میں ذرا ستانے کے لئے لیٹا ہے دیکھا اور دیکھ کر بیقرار ہوگئے، آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور افسوس وحسرت میں ڈوب گئے کس حسرت سے فرماتے ہیں:

"کاش کوئی صورت ایسی ہوتی کہ زندگی کا کھیل پھر سے شروع کیا جاسکتا، ضعف اور بڑھاپے کی جھرّیاں رعنائیوں میں تبدیل ہوجاتیں، گئی ہوئی بہار پھر لوٹ آتی مگر جو وقت گذر گیا کہاں واپس آسکتا ہے جو دِن بیت گئے وہ کہاں لوٹ سکتے ہیں، جو زمانہ گزر گیا وہ اب کہاں ہاتھ آسکتا ہے۔ ع

زمانہ دِگر گو نہ آئین نہار

اس وقت تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا مولانا کے سیاسی عقیدہ و مسلک سے تنفر انتہائی شباب پر تھا وہ ان کو برداشت کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے اس لئے کہ انھوں نے اپنے لئے جو

راہ اختیار کی تھی وہ مسلمانوں کے جذبات کے بالکل خلاف تھی مولانا کے انہی سیاسی مخالفین کو مخاطب کر کے یہ بھی لکھا کہ:

> ''صدر کانگریس کی حیثیت سے وہ جیسے بھی ہوں اس سے بحث نہیں شخصیت تو بہر حال جاذب اور دلکش رکھتے ہیں توحید و رسالت کے کلمہ گو ہیں دین و سیاست میں نہ سہی ادب اردو کی تاریخ نے ان کے لئے اپنے یہاں ایک ممتاز مقام تو ضرور مخصوص کر لیا ہے۔ ع

آخر گناہ گار ہوں کافر نہیں ہوں میں

مطلب یہ تھا کہ مولانا موصوف کی اگر اور حیثیتیں آپ کو تسلیم نہ ہوں تو کیا ایک ادیب وانشا پرداز کی حیثیت بھی جو متفق علیہ ہے آپ ان کی عزت نہیں کر سکتے، ان کا احترام ملحوظ نہیں رکھ سکتے، ان کا نام تعظیم واحترام کے ساتھ نہیں لے سکتے، ان کی دینی و علمی حیثیت بھی خدانخواستہ کوئی بحث طلب چیز ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت ہو، ملک کا ہر طبقہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے بلا اختلاف ان کو اردو کا سب سے بڑا ادیب سب سے بڑا انشاء پرداز اور سب سے بڑا خطیب اور زبان آور سمجھتا ہے، ان کی سحر بیانی و سحر نگاری کے دوست و دشمن سب قائل ہیں، 'الہلال'' کا ایک ایک حرف لعل و گوہر سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، ناممکن ہے کہ پڑھا جائے اور سننے والوں پر وجد نہ طاری ہو جائے، آپ کچھ اور نہ سہی تو اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر ان جیسے بڑے بزرگ کی جس نے آپ ہی کے نقطۂ نظر سے ماضی میں بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں صحافت کا پایہ بلند کیا ہے، اردو زبان کی خدمت کی ہے اردو خطابت کو معراج کمال پر پہنچایا ہے، عزت کیجئے ان کی قدر و عظمت اپنے دل میں پیدا کیجئے، اپنے سر آنکھوں پر ان کو بیٹھائیے، ان کی ذات کو اپنی عقیدت و محبت کا مرکز بنائیے اور اگر خدانخواستہ ان کی یہ مُسلّم و متفق علیہ حیثیت بھی آپ کو تسلیم نہ ہو اور ان کو کوئی منصب بھی دینے کے لئے تیار نہ ہوں تو مذاق سلیم بھی آخر کوئی چیز ہے اس کی تو آپ رعایت کر سکتے ہیں، اس پر تو حرف آنے سے روک سکتے ہیں یہ کیا ہے کہ جوشِ عناد میں اس کو بھی خیر باد کہہ دیجئے اور جو کچھ زبان پر آئے کہہ ڈالئے اور جو نوک قلم پر آئے لکھ ڈالئے۔ ع

کیر حفظ مراتب نہ کئی زندیقی

کچھ اسی قسم کے موقعہ پر آپ ہی کے کسی بزرگ نے کہا ہے لو کیا آپ اس کو بھی نظر انداز کر دیں گے، تہذیب و شائستگی کے مسلّم اصولوں کو بھی چھوڑ دیں گے۔

اہل سنت کے پاس تو توازن اور حفظِ مراتب کا یہ عالم ہے کہ ان کی عدالت میں خلیفہ راشد و برحق حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے باغی جناب امیر معاویہ بھی جب آتے ہیں تو شرف صحابیت سے معزول نہیں کر دیے جاتے، اعزاز و اکرام ہی کی مسند پر جگہ پاتے ہیں، تاریخ کے یہ روشن حقائق بھی آپ بھول گئے، عدل و تقویٰ کی راہ بھی آپ نے چھوڑ دی، اپنے اسلاف کی سنت بھی آپ نے ترک فرمادی۔"

یہ پوری عبارت مولانا آزاد کے ساتھ مولانا دریابادی کی محبت و عقیدت، شیفتگی، گرویدگی، خلوص و نیک نیتی کی آئینہ دار ہے۔

اس کا ان کے سیاسی مخالفین پر کیا اثر ہوا، یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ مخاطب درحقیقت وہی تھے لیکن اس کا ردعمل ان کے معتقدین پر جو ہوا وہ سخت حیرت انگیز ہے ان کے ایک معتقد کا خط خود مولانا دریابادی نے اپنے اخبار میں لفظ بہ لفظ شائع کر دیا ہے لیکن ہم میں اس کو نقل کرنے کی تاب نہیں ہے، اس لئے ہم قلم انداز کرتے ہیں۔

ان کے ایک دوسرے معتقد کا خط ہم اپنے الفاظ میں ذیل میں درج کرتے ہیں:

"یہ دریابادی بھی عجیب ہے مولانا جیسی جامع حیثیات و جامع کمالات ہستی کو اس نے جوش منافقت میں ادیب بنا دیا اور جسارت دیکھئے کہ ان کی اور ساری حیثیتیں جن میں بہت کم لوگ شریک ہیں سرے سے نظر انداز ہی کر دیں، سب تو سب مفسر قرآن تک کی حیثیت جس میں وہ بالکل منفرد ہیں اس کو بھی تسلیم نہیں کیا گویا دین مذہب کی ساری اجارہ داری اسی کے ہاتھ میں ہے کسی کو کچھ جاننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتا، اس قدر رعونت پسند و خود بین ہے۔"

یہ بدگمانی یہ سوء ظن محض اس بنا پر ہے کہ مولانا دریابادی بھی کسی قدر ذہنا مسلمانوں کے

سوادِ اعظم کے ساتھ تھے، ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو نیشنلسٹ طبقہ کیسے برداشت کرسکتا تھا، اس نے مولانا کی اہانت، تذلیل، دشنام طرازی کا کوئی دقیقہ اٹھانہیں رکھا وہ جتنا آگے بڑھتے گئے مولانا اتنا ہی پیچھے ہٹتے گئے اور پھر خاموش ہو گئے۔ ع

جواب جاہلاں باشد خموشی

اس پر انھوں نے شدت کے ساتھ عمل کیا۔

آپ ہی انصاف فرمائیں شدت ہم ذوقی کی بنا پر اڈیٹر ''صدق'' مولانا سے قریب تر نہیں ہوں گے تو کیا وہ لوگ ہوں گے جن کو سیاسی ہم عقیدگی کے علاوہ مولانا کے علم وفضل اور ذوق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، ان کی اور حیثیات کے مقابلہ میں قرآن کے علوم ومعارف کا راز داں ہونا ہے اور یہ حیثیت ان کی تمام حیثیات پر غالب ہے، ہندوستان میں تنہا ان کی ذات ہے جس نے لوگوں کو قرآن کی طرف متوجہ کیا، مولانا محمد علی نے اگر یہ کہا تو بالکل صحیح کہا کہ اسلام میں نے دو بزرگوں سے سیکھا، ایک ''شکوہ جواب شکوہ'' کے مصنف اقبال سے۔ اور دوسرے مولانا ابوالکلام سے۔ ہمارے ملک اور ہماری زبان اردو کے مشہور روزگار شاعر حسرتؔ نے ایک زمانہ میں مولانا کی اردو انشا پردازی کے متعلق فرمایا تھا۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظمِ حسرتؔ میں بھی مزا نہ رہا

اس کی ذہانت کا اس کی جودت کا اس کے فکر وعمل کی بے پناہی کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا وہ اسم بامسمّیٰ ہے، وہ صحیح معنی میں ابوالکلام ہے، سحر طراز خطیب ہے، قادر بیان مقرر ہے، بولتا ہے تو اس کے منھ سے پھول جھڑتے ہیں، لکھتا ہے تو موتی پردتا ہے، اس کی شخصیت پر پورے ہندوستان کو ناز ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی ادیب ان دونوں کے خواجہ تاش ہیں ایک ہی خرمن کمال کے دونوں خوشہ چیں ہیں، مولانا شبلی کی بارگاہ علم ودانش میں دونوں کا گذر تھا، ایک کی ادبی یادگار ''الہلال'' کی چار سال کی جلدیں ہیں دوسرے کی ''فلسفہ جذبات'' اور تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ۔ دونوں ہی اپنے ذوق کے لحاظ سے قرآن کی خدمت کررہے ہیں، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

''مشہد اکبر''

مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

جہاں سے مولانا سید سلیمان ندوی کی مخالفت اور مولانا ابوالکلام سے ان کے مقابلہ اور موازنہ کا شرانگیز فتنہ اٹھا ہے وہیں سے یعنی جامع عمر آباد نارتھ ارکاٹ سے ایک اہل درد اور صاحب خیر اسم بامسمیٰ جناب ابوالخیر صاحب پیارم پیٹی نے ایک مراسلہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس فتنہ کے متعلق لکھا تھا، جس کے ساتھ انھوں نے مولانا دریابادی کے ایک مضمون کی نقل بھیجی تھی جو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر لکھنؤ کے ایک جلسہ تعزیت منعقدہ دارالعلوم ندوہ میں ''سید سلیمان اڈیٹر کی حیثیت سے'' ۲۶ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو پڑھا تھا، اس کے متعلق صاحب مراسلہ کا خیال ہے کہ اس نزاع میں بہترین محاکمہ کا کام دے سکتا ہے، مولانا دریابادی نے ان کی اس رائے سے اتفاق کر کے ان کا مراسلہ اور وہ مضمون ۱۵ر اگست سن ۵۴ء کے صدق میں شائع کر دیا ہے لیکن اس کا عنوان ایسا رکھا ہے کہ اس پر کسی کی نظر پڑی ہوگی اور کسی کی نہیں پڑی ہوگی، ہمارے نزدیک وہ محاکمہ فیصلہ کن تحریر ہو یا نہ ہو لیکن الہلال کے مشہد اکبر نمبر ا، والے مضمون کی ایک موثق ترین اور مستند ترین شہادت ضرور ہے جس سے کسی صاحب نظر، اہل بصیرت کو انکار نہیں ہوسکتا، یہ مضمون مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات حسرت آیات کے پورے ایک مہینہ کے بعد لکھا گیا تھا، اور اسی زمانہ میں ''صدق جدید'' میں شائع ہوا تھا، اس میں ''مشہد اکبر'' والے مضمون کے متعلق جو حقائق پیش کئے گئے ہیں ان کی تردید نہ خود مولانا ابوالکلام نے کی جو اس وقت بحمد اللہ زندہ تھے، نہ ان کے کسی معتقد اور نیازمند نے۔ ہم اسی تحریر کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

مولانا دریابادی ''الہلال'' کے قدرداں اور خریدار ہی نہیں تھے بلکہ اس کے بہترین اور اعلیٰ ترین مضمون نگاروں میں تھے، ان کی محض ابتدائے زندگی کی ایک کتاب ''فلسفہ جذبات'' کے بعض مصطلحات مثلاً حظ وکرب اور لذت والم کے مترادفات پر مدیر الہلال اور مولانا دریابادی کے درمیان تلخ وتند مباحثہ الہلال ہی کے صفحات میں ہوا تھا، جس کی یاد اب تک تازہ ہے جس میں مولانا ہی کا پہلو غالب تھا، اس کا اعتراف خود مولانا دریابادی نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ ایک موقع پر کیا ہے، مولانا دریابادی کے حسن بیان، قوت نقل علوم وتسہیل مطالب کے مولانا بے حد مداح تھے اور اس بنا پر موصوف کو ان سے بڑی بڑی توقعات تھیں، جن میں سے ایک یہ تھی کہ نقلی علوم میں انشاء اللہ یہ وہ کام کریں گے جواب تک کسی سے نہیں ہوا، مولانا کی توقعات کس حد تک دریابادی صاحب نے پوری کیں اس کا اندازہ ''صدق جدید'' کے مضامین، شذرات، نوٹس، مقالات اور بعض مستقل تصنیفات اور ان سب سے بڑھ کر ''تفسیر ماجدی'' سے جو اردو اور انگریزی زبانوں میں ایک ساتھ چھپ رہی ہے کیا جاسکتا ہے، قرآن پاک کے مطالب ومعانی کے فہم وتعبیر کی حد تک مولانا کے تمام معاصرین میں مولانا دریابادی سے بڑھ کر ان سے کوئی قریب تر نہیں، اس اعتبار سے مولانا کے تمام مخصوصین، محبین ومحسنین پر ان کو علانیہ فضیلت حاصل ہے، افسوس ہے کہ موت نے ایک کا سلسلۂ فیض منقطع کردیا اور دوسرے کا بحمد اللہ مختلف صورتوں اور شکلوں میں پوری پابندی والتزام وتسلسل کے ساتھ جاری ہے، جس سے ہر شخص بقدر حوصلہ وظرف مستفید ومتمتع ہوسکتا ہے، خدا سے دعا ہے کہ ہندوستان کے اس منفرد مفسر قرآن کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے، مولانا کا علامہ دریابادی سے جو قلبی تعلق تھا اس کا اندازہ اس خط سے بھی ہوسکتا ہے۔

مولانا دریابادی نے دورِ اول کے الہلال کے لئے کوئی مضمون بھیجا تھا جس کا شاید مدیر الہلال کو بڑا انتظار تھا تو ان کو کس محبت اور پیار سے لکھتے ہیں۔

دیر آمدی اے نگارے سرمست　　　　زودت ندیم دامن از دست

''صدیقی العزیز! عطیہ گرامی کا شکریہ، حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہوجائے گا۔''

کتنا بڑا ظلم ہے کہ ظالموں نے ایسے دوست مخلص کو بھی مولانا کے معاندین کی صف میں لا کھڑا کیا

۷۔ فیا اسفاہ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد سید صاحب کے جوہر شناس شروع ہی سے تھے ادھر الندوہ سے وہ سبکدوش ہوئے اُدھر مولانا ابوالکلام نے انہیں کلکتہ اپنے ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' کے لئے کھینچنا شروع کیا، الہلال میں خاص اس مذاق کے عبداللہ عمادی پہلے سے موجود تھے، لیکن سید صاحب کی بات ہی کچھ اور تھی سید صاحب جب الہلال میں پہنچتے ہیں تو نام کا تو الہلال ہی رہا لیکن اہل بصیرت دیکھ رہے تھے کہ ہلال بدر بن گیا ہے اور اس کی نورافشانی کلکتہ تو کلکتہ شرق وغرب، شمال وجنوب سب کو مطلعِ انوار بنا رہی ہے، خود عربی کے قدیم وجدید دونوں طرح کے ماخذوں کی مدد سے مسلمانوں کے لئے دینی تمدنی، سیاسی، تاریخی ہر عنوان سے متعلق بہترین معلومات پیش کرنا یہ سید صاحب کا کام تو تھا ہی باقی خود ہندوستان کی سیاسیات حاضرہ پر مقالات لکھنے میں سید صاحب الہلال کے چیف اڈیٹر یا مدیر مسئول سے پیچھے نہیں رہے۔ افسوس ہے کہ الہلال کی جلدیں گھر کے ایک ناقدر شناس بلکہ خائن ملازم نے ردی کے لالچ میں بیچ دیں۔ ورنہ سید صاحب کی الہلالی تحریروں کے اقتباسات جوں کے توں پیش کردیئے جاتے، اس وقت کہنا، صرف یہ ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام دونوں اگرچہ اپنے اپنے رنگ میں اردو ادب کے لئے باعثِ ناز ہیں لیکن بڑا فرق دونوں کے رنگ میں ہے، شبلی کے یہاں یہ احتیاط اور رکھ رکھاؤ کہ بلاضرورت دو لفظ بھی قلم سے نہ ٹپکیں اور ہر تکرار کا حشو وزوائد میں شمار پھر تشبیہ واستعارے اگر ہلکے قسم کے کبھی دبے پاؤں آبھی جائیں تو بس ایسے کہ سلاست کلام میں ذرہ بھی مخل نہ ہوں، ابوالکلام کے یہاں وہ فیاضی کہ نئی نئی تشبیہیں اور حسین وجمیل استعارے جیسے قلم سے اُبلے پڑتے ہیں اور پھر الفاظ ومترادفات کا وہ ریلا کہ پڑھنے والا ان ہی میں گم ہو کر رہ جائے۔

سید صاحب کے اسلوب بیان وطرز نگارش میں اگرچہ انفرادیت شروع ہی سے تھی اور مقلد محض تو وہ کسی کے بھی نہ تھے، پھر بھی مولانا شبلی کا رنگ ان پر اچھا خاصا چھایا ہوا، اور شبلیت قدرۃً

ان کے قلم کا جز اس وقت تک بن چکی تھی لیکن اب جب وہ ''الہلال'' میں آئے تو گویا دوسرے ابوالکلام بن گئے، ان کے رنگ میں اس طرح ڈوب کر اور اس درجہ ان کے ہر رنگ ہو کر لکھنا شروع کیا کہ اچھے اچھے اہل نظر کو بھی امتیاز دشوار ہو گیا۔ ع

من تو شدم تو من شدی

کا بندہ ہو گیا۔ ابوالکلام کے طرز بیان کی تقلید آسان نہیں، بڑے بڑوں نے جب اس روش پر چلنا چاہا تو راہ میں پیر پھسل پھسل گئے ہیں، یہ کمال سید صاحب ہی کا تھا کہ شبلیت سے جب چاہا الگ ہو کر ابوالکلامیت اختیار کر لی اور پھر اس رنگ کو بھی جب چھوڑنا چاہا اوراق دہر پر نقش سلیمانی کی مہر لگا کر دکھا دی۔

۱۹۱۳ء میں جب کانپور کی ایک مسجد کے غسل خانہ کا سرکاری حکم سے گرانے کا ہنگامہ پیش آیا اور پولس کی گولیوں سے کچھ مسلمانوں (جن میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی تھے) کی جانیں گئی اس وقت الہلال میں ایک بڑے طنطنہ کا مقالہ افتتاحیہ ''مشہد اکبر'' کے عنوان سے نکلا تھا جس نے نہ معلوم کتنوں کو سسکیوں بھرے غم کے ساتھ رُلا دیا اور کتنوں کو غیظ و غضب کے جوش کے ساتھ اُکسایا (وہ انہی مولانا سید سلیمان ندوی کا اور بالکل مولانا ابوالکلام کے مخصوص خطیبانہ رنگ میں تھا) اُسے آج بھی اُٹھا کر دیکھئے کہیں سے پتہ نہیں چلے گا کہ یہ مضمون ابوالکلام کا نہیں ان کے ادبی ہمزاد و خواجہ تاش کے قلم کا ہے، سید مرحوم داستانِ بزم کے بادشاہ تو تھے ہی بقول شخصے ع

ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

لیکن جب رزمیہ لکھنے پر آئے جب بھی ان کی شخصیت پکار اٹھی ع

ہے زباں میری تیغ جوہر دار

(۱۵راگست ۱۹۶۰ء ''صدق جدید'' اور یکم ستمبر ۱۹۶۰ء ''مدینہ'' بجنور میں شائع ہوا۔)

☆☆☆

’’معارف‘‘ سلیمان نمبر

اور

مولانا عبدالماجد دریابادی سے ہماری توقعات

اِدھر دو تین برسوں کے اندر اردو رسالوں کے جو متعدد شخصیات نمبر نکلے ہیں ان میں رسالہ ’’معارف‘‘ اعظم گڑھ کا ایک سلیمان نمبر بھی ہے جو دار المصنفین اعظم گڑھ کے بانی اردو کے مشہور مصنف اور ملک کے سب سے بڑے سیرت نگار مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بارگاہ میں رفقائے دار المصنفین نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، اس میں حصہ لینے والے اردو کے چوٹی کے ادیب، انشاپرداز اور اہل قلم ہیں جو بجائے خود بڑی اہمیت اور ہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں اردو ادب کو ان کے وجود پر ناز ہے، میری مراد پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، جناب مالک رام، ایم اے سے ہے، اس سے اردو کے سوانحی ادب کے ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ ہوا ہے، لیکن یہ پورا نمبر اپنے گوناگوں مضامین، بوقلموں مقالات، رنگارنگ تاثرات کے باوجود کسی طرح بھی ’’سیرت سلیمانی‘‘ کا بدل نہیں ہوسکتا۔

سلیمان نمبر کے تمام مضامین کا مقصد صاحب معارف کے ساتھ اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار ہے جس میں ہر مضمون نگار نے اس کا حق ادا کردیا ہے، ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا مضمون ’ادب وانشاء کی جھلکیاں‘ بہت دلچسپ اور سید صاحب کے ساتھ ان کے خلوص کا پورا مظہر ہے، جس میں اجمال کے ساتھ سید صاحب کی نثرنویسی اور انشاپردازی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو ایک ادیب اور انشاء پرداز کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کے مختلف ادبی وتنقیدی ولسانی

مضامین سے ان کی انشاء پردازی کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے گئے ہیں لیکن یہ مضمون جس قدر دلچسپ، دلآویز اور اچھوتا ہے، اسی قدر تشنہ بھی ہے، دوسرے وہ سید صاحب کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر ہے جس کی خود صاحب معارف کے نزدیک چنداں اہمیت نہیں تھی، انھوں نے اپنے کو ایک ادیب، انشاپرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے کبھی پیش نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ ادیب وانشاپرداز ہی نہیں بہت اچھے شاعر بھی تھے لیکن ان کے یہ کمالات ان کے اور کمالات علمی کے سامنے دب گئے تھے، دنیا نے ان کو ایک ادیب، انشاپرداز، وشاعر سے کہیں زیادہ ایک بلند پایہ مصنف، ایک دقیقہ رس مورخ، ایک وسیع النظر متکلم ایک نکتہ شناس فقیہ، ایک عاشق رسول، ایک ماہر اسرار وحی وتنزیل، ایک عالی پایہ محدث، مفسر اور مفکر کی حیثیت ہی سے جانا پہچانا اور انہی گوناگوں کمالات کی بناپر وہ اپنے سارے معاصرین میں ممتاز تھے، اور تمام علمی دنیا پر ان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، جن سے ملتے تھے وہ متاثر ہو جاتے تھے، اور جس بزم میں پہنچ جاتے تھے چھا جاتے تھے، ڈاکٹر اقبال تو ان کو علوم اسلامیہ کا جوئے شیر کا فرہاد سمجھتے تھے اور ان کے کمالات کے بڑے معترف تھے، فرماتے تھے کہ

> ''سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینہ پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم وفضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں۔ اور ہزاروں کھیتی کھیتیاں سیراب ہو رہی ہیں۔''

یہ اعتراف وقبول ایک طرفہ نہیں تھا، سید صاحب بھی ان کے کمالات کے ویسے ہی معترف تھے ان کو دین کامل کا علم بردار، فلسفۂ قرآن کا ترجمان، کاروانِ ملت کا حدی خواں، سمجھتے تھے جن کے دہن کا ہر ترانہ ''بانگ درا'' جن کی جانِ حزیں کی ہر آواز ''زبور عجم'' جن کے دل کی ہر فریاد ''پیام مشرق'' جن کا ہر شعر ''پرِ پروازِ جبریل'' جن کی زندگی کا کارنامہ ''جاوید نامہ'' جن کے فلک اعجاز کی ہر جنبش ''ضرب کلیم'' تھی، ان کا انتقال ہوا تو معارف میں خونِ دل سے ان کا دلدوز ماتم لکھا۔

حکیم الامت کا داستان طراز، ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کا مصنف، مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک ہی پہلو پر نہیں مختلف پہلوؤں پر لکھ کر دادِ انشا پردازی دے سکتا تھا، وہ ان کے حالات وسوانح

،وقائع زندگی سے جتنا واقف ہیں ان کے مخصوص رفقا،اعزا وتلامذہ کو چھوڑ کر کم ہی لوگ اتنا واقف ہوں گے، ندوہ کی طالب علمی سے لے کر پاکستان کے سفر بلکہ نفس واپسیں تک ان سے شدید تعلقات تھے، معلوم نہیں ان تعلقات وروابط، اخلاص ومحبت کے کتنے نقوش ان کے قلب ودماغ پر مرتسم ہوں گے، جو اگر ''محمد علی کی ڈائری'' کی طرح صفحۂ قرطاس پر آجاتے تو اردو ادب وانشا کے خزانہ میں ایک اور قیمتی متاع کا اضافہ ہو جاتا لیکن ہماری یہ تمنا تمنا ہی ہے جس کے پورے ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ممکن ہے آپ بیتی میں جو آئندہ کبھی ''صدق جدید'' کے صفحات میں آنے والی ہے، یہ نقوش کہیں کہیں اُجاگر ہو جائیں اور ہم جیسے تشنہ کامانِ ادب ماجدی کے لئے سامانِ تسکین بن جائیں اگر حکیم الامت کی صورت میں ۱۵ سالہ تعلقات وارادت کا ایک دلآویز مرقع تیار ہو سکتا ہے اور محمد علی ذاتی ڈائری کی شکل میں اجرائے ''ہمدرد'' سے لے کر ۱۹۳۲ء تک کے روابط کی داستان بیان کی جا سکتی ہے تو یقیناً سید صاحب کے ساتھ نصف صدی کے تعلقات کی تاریخ بھی لکھی جا سکتی ہے۔

دارالمصنفین کے سنگم پر مشرق ومغرب کے یہ دونوں دھارے اس طرح مل گئے تھے کہ ان میں باہم تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا، ایک اگر مشرق کا ادب وفلسفہ اردو میں منتقل کر رہا تھا تو دوسرا مغرب کا ذہنی سرمایہ اور اس کا گرانقدر فلسفیانہ لٹریچر اردو میں پیش کر رہا تھا۔ ''ارض القرآن'' اور ''سیرت عائشہ'' کے ساتھ ''برکلے اور مکالمات برکلے'' جیسی اہم کتابیں بھی شائع ہو رہی تھیں جن میں پرزور دلائل سے مغرب کی مادیت کا ابطال اور وجود باری کا اثبات کیا گیا ہے، ایسے ہم ذوق، ہم فکر، اور ہم خیال معاصر بزرگوں کی داستان حیات سننے کا کون مشتاق نہ ہوگا۔

سید الملت نے اپنی ذاتی محنت وجانفشانی سے جو کمالات جمع کر لئے تھے، ان میں ان کے معاصرین میں شاید ہی کوئی شریک رہا ہو یہاں تک کہ اپنی مسلسل علمی وتحقیقی تگ ودو اپنے سب سے بڑے حریف اور مد مقابل مولانا ابوالکلام آزاد تک کو انھوں نے پیچھے چھوڑ دیا تھا وہ الہلال میں چند ولولہ انگیز مضامین لکھ کر رہ گئے اور تفسیر ترجمان القرآن شروع کی تو وہ بھی نا تمام ہی رہ گئی، ان کے معتقدین عرصہ تک اس کی تکمیل کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

ایک عرصہ کی خاموشی کے بعد قلعہ احمد نگر جیل سے یہ ''غبار خاطر'' لے کر نکلے جو ان کے۔

چند فرضی خطوط کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے عالم خیال میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو مخاطب کر کے لکھے تھے جو واقعی ان کا ایک ادبی اعجاز ہے لیکن سید صاحب نے سیرۃ النبی کی چھ ضخیم مجلدات کے علاوہ جو ان کی زندگی کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ''عرب و ہند کے تعلقات''، ''خیام''، ''عربوں کی جہاز رانی'' وغیرہ جیسی بیش قیمت تحقیقی کتابیں لکھیں جنھوں نے مشرق تو مشرق یورپ کے فضلاء و مستشرقین تک سے خراج تحسین وصول کرلیا اور ''خیام'' تو ان کی وہ کتاب ہے جس میں پہلی مرتبہ اردو میں ''خیام'' کی صحیح حیثیت کو پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ شاعر سے کہیں زیادہ حکیم وفلسفی ومنجم تھا، اس کی کامیابیاں تو درحقیقت اس کے کمال علمی کا پرتو ہیں جن کو یورپ اب تک ذوق تعیش پسندی کی وجہ سے اس کے اصل کارنامہ کے طور پر پیش کرتا آرہا تھا اسی جامع کمالات ہستی کی سوانح عمری جس قدر ضروری ہے وہ ظاہر ہے یہ کام سب سے بہتر طور پر یا تو مولانا عبدالماجد دریابادی ہی انجام دے سکتے ہیں جنھوں نے ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ڈائری'' کے نام سے کتابیں لکھی ہیں جن میں اپنے ہیروؤں کے ساتھ انتہائی عقیدت ومحبت کے ساتھ ان کی سوانح عمری کا بھی حق ادا کر دیا ہے جن پر مشکل ہی سے کوئی انگلی رکھ سکتا ہے۔

یہ سوانح عمری محض ایک شخص کے حالات ووقائع زندگی ہی نہ ہوں گے بلکہ پورے ایک دور کی علمی و مذہبی وقومی، وملی تاریخ ہوگی اور اتنی ہی اہم جیسی ''حیات جاوید'' اور ''حیات شبلی'' ہے، حیات جاوید اگر سرسید کے دور کی مفصل تاریخ اور دیار مشرق کے لاتعداد علماء وفضلاء وارباب درس وتدریس کا تذکرہ ہے، اسی طرح ''سیرت سلیمان'' شبلی کے بعد کے دور کی ایک تاریخی داستان ہوگی، اتنی دلچسپ ودلآویز جتنی دونوں متقدمۃ الذکر کتابیں جن کو اردو کے سوانحی ادب میں بہت اونچا مقام حاصل ہے، سید صاحب کی ذات بھی سرسید اور علامہ شبلی کی طرح بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی اور ان کے کاموں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، اسلامی علوم وفنون کا ہر شعبہ اور قوم وملت کی زندگی کا ہر گوشہ ان کے شاندار کارناموں کا تماشا گاہ ہے۔

ظاہر ہے کہ معارف کا سلیمان نمبر سیرت سلیمانی کا بدل نہیں تھا اور نہ درحقیقت بدل کے طور پر شائع ہی کیا گیا تھا جیسا کہ فاضل مرتب نے خود ہی لکھا تھا کہ اس اجمال کی تفصیل ''حیات

سلیمان'' میں پیش کی جائے گی لیکن چوں کہ ہم کو اس طرح کے وعدوں کا بڑا تلخ تجربہ تھا، اس لئے اس کا یقین نہیں آیا، دارالمصنفین میں بہت سے سلسلے شروع کئے گئے وہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکے، سیرت کی ساتویں جلد جو معاملات پر تھی اور جس کے کچھ حصے بطور نمونہ کے ''معارف'' میں شائع بھی ہو چکے تھے اس کی تکمیل کی بشارت ہم کو نہ مل سکی، اسی طرح ''رقعات عالمگیر'' کے جمع و ترتیب کا کام بڑے ہمہمہ کے ساتھ شروع کیا گیا تھا لیکن وہ بھی اتمام کو نہیں پہنچ سکا، صرف اس کی ایک ہی جلد جو برادرانہ جنگ سے تخت نشینی تک رقعات پر مشتمل ہے شائع ہو سکی۔ ''تاریخ اسلام'' کے سلسلہ بھی عباسیوں تک آ کر رک گیا حالانکہ ان کے بعد بھی مسلمان خاندانوں نے دنیا کے مختلف حصوں اور خطوں پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکومت کی اور جریدۂ عالم پر ان کے ہزاروں نقوش ثبت ہیں ان کی تاریخ بھی اسی سلسلہ کی چیز تھی لیکن نہیں لکھی گئی، ناموران اسلام کے سلسلہ میں صرف عمر ابن عبدالعزیزؒ شائع ہو سکی، حالانکہ یہ مولانا شبلی کے پروگرام میں تھا، اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو ''المامون'' اور ''الفاروق'' کے بعد کسی اور فرمانروا خاندان کے ہیرو کے حالات قلم بند فرماتے، بنو امیہ میں ان کے پیش نظر ولید بن عبدالملک تھا جس کے عہد میں فتوحات اسلامی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا، لیکن اس کے بجائے عمر بن عبدالعزیز کو ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے ترجیح دی گئی، اور ان کی لائف لکھی گئی، وہ تاریخ میں عدل و انصاف کے لحاظ سے عمر ثانی کے پُر فخر لقب سے مشہور ہیں، بلکہ عربی میں تو حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ''سیرت العمرین'' کے نام سے ساتھ ساتھ سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں، حق تھا کہ تاریخ ہند کے سلسلہ میں مغل خاندان کے ہیرو اورنگ زیب عالمگیر کی سوانح عمری لکھی جاتی مگر یہ بھی نہیں لکھی گئی، پہلی جلد پر جو طویل مقدمہ الگ کتابی صورت میں شائع ہوا جو بلاشبہ مولانا سید نجیب اشرف ندوی کے قلم کا شاہکار ہے وہ صرف برادرانہ جنگ سے لے کر تخت نشینی تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، اس پر سوانح عمری کا اطلاق نہیں ہو سکتا، انہی تلخ تجربوں کی بنا پر ''حیات سلیمان'' کی تکمیل کی طرف سے بھی ہمیں شبہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مضامین اورنگ زیب عالمگیر کی طرح سید صاحب کی سوانح عمری کے لئے معارف کے سلیمان نمبر ہی پر کہیں اکتفا نہ کر لیا جائے، اسی لئے ہم بار بار فرضی ناموں سے مضامین

لکھ کر فاضل مرتب کو اس کی طرف توجہ دلاتے رہے۔

لیکن ہم نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے ''صدق جدید'' ہی کے ذریعہ جو درخواست پیش کی تھی وہ اب تک ہماری بدقسمتی سے درخور اعتنا نہ ہوسکی، ہمارا خیال ہے کہ ان کی رعنائی قلم کا اصلی تماشا گاہ وہی کتاب ہوگی جس کی ہم نے موصوف سے درخواست کی ہے، اسی سلسلہ میں ان کے قلم سے دارالمصنفین کی ایک جامع تاریخ بھی آجائے گی جس کے قائم کرنے والوں میں وہ بھی ایک ہیں، اس کی مجلس عاملہ میں سرفہرست انہی کا نام ہے وہ سید صاحب کے سفر یورپ کے زمانہ میں اس کے رفقاء کے نگراں اور معارف کے قائم مقام مرتب بھی رہ چکے ہیں اور مہینوں تک شذرات وہی لکھتے رہے ہیں، سید صاحب نے یورپ کے مختلف ملکوں سے انہی کو زیادہ خطوط لکھے تھے جو ''برید فرنگ'' کے نام سے شائع بھی ہو چکے ہیں، اس سے بھی بڑا شرف ان کو یہ حاصل تھا کہ دفتر سیرت اکاڈمی کا تخیل کتنا اونچا تھا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بغیر حکومت اور قوم کے سہارے فرنچ اکاڈمی کے طور پر ہندوستان میں بھی اکاڈمی قائم ہوسکتی ہے لیکن مولانا شبلی کے وصال کے بعد انہی کے تصور کی روشنی میں ان کے علمی وارثوں نے جن میں مولانا شبلی سے استفادہ واستفاضہ کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادی بھی داخل ہیں، اکاڈمی قائم کردی جو اپنے زبردست علمی کارناموں کی بدولت فرنچ اکاڈمی سے کسی طرح کم نہیں ہے اور اس نے اب تک مختلف فنون پر ڈیڑھ سو سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جس طرح یہ اونچا تخیل زمانہ کی نامساعدت کے باوجود عمل میں آگیا اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی اور سید صاحب کے باہمی تعلقات کی تاریخ کا تصور بھی عمل میں آسکتا ہے، دیکھیں ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کا داستان گو کب یہ داستان سناتا ہے شائقین اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ادب وانشاء کے پرستار گوش برآواز ہیں۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام میرا ایک خط

مجھے جہاں ہر مکتب فکر کے بعض مشاہیر کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اوران سے خط وکتابت تھی وہاں ملک کے مشہور ادیب، وفلسفی ومفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی اڈیٹر ''صدق جدید'' سے بھی بڑی عقیدت تھی اور کبھی کبھی ان کو بھی خط لکھتا تھا اور وہ اس کا جواب اپنی تمام گوناگوں ادبی وتفسیری اور ''صدق جدید'' کی ادارتی مشغولیتوں کے باوجود جن میں وہ کسی کا مخل ہونا پسند نہیں فرماتے تھے، فوراً جواب دیتے تھے، یہ گرانمایہ خطوط میرے لئے بہت بڑا طغرائے امتیاز ہیں جن پر میں جتنا ناز کروں کم ہے، انھوں نے ازراہِ ذرہ نوازی میرے بعض طویل خطوط ''صدق جدید'' میں بھی شائع کئے، مجھے ان سے بڑی فکری ہم آہنگی تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے لوگوں کے اچھے اور تعمیری کاموں کو پسند کرتے تھے اوران کی داد دیتے تھے، میں بھی پسند کرتا ہوں اور دل کھول کر داد دیتا ہوں قرآن مجید میں بھی ہے:

اٰتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ.

''ہر صاحب فضل کی فضیلت اور بڑائی کا اعتراف کرو۔'' مولانا عبدالماجد دریابادی اہلحدیث طبقہ کی دینی وعلمی خدمات کے بھی معترف۔ تھے اور اس عہد کے بعض مشاہیر اہلحدیث علماء سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے، ان ہی میں مولانا عبدالرؤف خاں صاحب جھنڈانگری بھی تھے جن کے مدرسہ جھنڈانگر کے اشتہارات رمضان کے موقعہ پر اپنے نوٹ کے ساتھ برابر ''صدق جدید'' میں شائع کرتے تھے، میں پہلے پہل نیپال کی اس واحد عظیم الشان دینی وعربی درسگاہ سے انہی اشتہارات کے ذریعہ واقف ہوا جس کو ظلمت کدۂ نیپال میں منارۂ نور کی حیثیت

حاصل ہے، مولانا اہلحدیث کے مسلک کے افراد سے متعلق میرے ہفوات بھی جو ''الاعتصام'' لاہور اور ''ترجمان'' دہلی میں شائع ہوتے تھے، بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے، ان کو کوئی مضمون پسند آجاتا تھا تو مجھ کو خط لکھ کر داد بھی دیتے تھے، علی گڑھ کے مشہور قومی وملی وسیاسی رہنما عبدالمجید خواجہ بیرسٹر کے متعلق انہیں کے ذریعہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلکاً اہلحدیث تھے اور ان پر میں نے اہلحدیث جماعت کے ایک ممتاز اور جلیل القدر فرد کی حیثیت سے ''ترجمان'' دہلی میں یوسف حسین خاں کی ''یادوں کی دنیا'' کی مدد سے بہت مفصل مضمون لکھا، انھوں نے ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کی وفات پر ''صدق جدید'' میں تعزیتی نوٹ لکھا تو اس میں اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر یہ بھی لکھا کہ وہ عقیدۃً اور مسلکاً اہلحدیث تھے، لیکن مولانا ابوالحسن ندوی کے خاندان کے لوگوں سے اس کی فوراً تردید کی کہ وہ کسی زمانہ میں بھی اہلحدیث نہیں تھے، وہ شروع سے حنفی اور مقلد تھے، اخبار میں یہ تردید میری نظر سے گذری تو مجھے بڑا تعجب ہوا اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب ان ڈاکٹر صاحب کا شاہ علیم اللہ اور ان کی چوتھی پشت کے گلِ سرسبد سید احمد شہیدؒ کے خانوادہ رشد وہدایت سے تعلق ہے تو پھر خواہ مخواہ اس کی تردید کی کیا ضرورت تھی جب کہ اس خانوادے سے نسلی تعلق اور روحانی عقیدت رکھنے والوں کی اکثریت اہلحدیث ہے اور پھر اہل حدیث ہونا کوئی عیب کی بات تو نہیں تھی اسی دودمانِ خیر وبرکت کی ایک شاخ پنجاب میں بس گئی تھی جس کے گل سرسبد مشہور ماہر غالبیات مولانا غلام رسول مہرؔ تھے جنھوں نے ''سیرت سید احمد شہید'' لکھی ہے اور یہ اہل حدیث تھے۔

مولانا کو جب معلوم ہوا کہ میں بھی اہل حدیث ہوں اور اہل حدیث طبقہ سے تعلق رکھتا ہوں تو انھوں نے ایک خدمت میرے سپرد کی اور مجھ کو لکھا کہ:

> ''مجھے اہل حدیث طبقہ میں قرآن کے جو مترجمین ومفسرین وحاشیہ نگار گذرے ہیں یا موجود ہیں ان کے ناموں کی ایک فہرست چاہیے، تم اس طبقہ کے کسی باخبر عالم سے جن سے تمہارے تعلقات ہوں مرتب کراکے بھیج دو مجھ کو اس کی سخت ضرورت ہے۔''

اس زمانہ میں میرے مولانا نذیر احمد املوی شیخ الحدیث مدرسہ رحمانیہ بنارس سے خط

وکتابت شروع ہوچکی تھی، اس اہم علمی کام کے لئے میری نظرانتخاب اِن ہی پر پڑی، میں نے ان کو خط لکھا تو بہ مسرت تمام اہلحدیث طبقہ کے علمائے مفسرین کی بہت ہی مکمل فہرست مرتب کرکے بواپسی ڈاک بھیج دی، وہ فہرست تو میں نے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ کرلی کہ جب کبھی اپنے نام کے تمام مشاہیر کے خطوط ہر مضمون لکھنے کی سعادت حاصل کروں گا تو اس میں اس خط کا بھی ذکر کردوں گا جس کو میں حرز جاں بنائے ہوئے ہوں، اس کی نقل مولانا دریابادی کو بھیجی تو موصوف نے شیخ الحدیث مولانا املوی اور ناچیز کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

مولانا عبدالرؤف خاں صاحب جھنڈانگری نے نوگڑھ بستی کی عظیم الشان اہلحدیث کانفرنس میں اپنے ذاتی تعلقات کی بناپر مولانا دریابادی اور حکیم عبدالقوی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا، مولانا تو نہیں پہنچ سکے لیکن حکیم عبدالقوی صاحب شریک ہوئے تھے اور کیا عجب ہے کہ وہاں سے آنے کے بعد کانفرنس سے متعلق اپنے تاثرات ومشاہدات ''صدق جدید'' میں بھی لکھے ہوں، لیکن وہ میری نظر سے نہیں گذرے، میں بھی خاص دعوت پر اس کانفرنس میں دونوں شیوخ حدیث یعنی محدث مبارک پوری ومحدث املوی کے ساتھ اس کانفرنس میں شریک ہوا تھا جس کے تمام مناظر اب تک میری نگاہوں میں ہیں۔

عرصہ ہوا مولانا مختار احمد ندوی ناظم ادارہ سلفیہ بمبئی نے اخبار ''اہلحدیث'' دہلی میں حافظ عبداللہ غازیپوری کے سوانح وحالات پر ایک مضمون لکھا تھا اس کی ایک خط میں ایک مستند راوی کی روایت سے حافظ صاحب موصوف کی خاکساری، تواضع اور فروتنی کا بہت ہی حیرت انگیز واقعہ لکھا تھا جس سے میں بہت متاثر ہوا، بعد میں اپنی کسی قدر تمہید حافظ صاحب کے مختصر تعارف فنِ حدیث میں ان کی مرتبت اہلحدیث طبقہ میں ان کی غیر معمولی مرجعت کے ذکر کے ساتھ اس کو نقل کرکے مزید افادہ وعبرت کے لئے مولانا دریابادی کے پاس ''صدق'' میں اشاعت کے لئے بھیج دیا تو انھوں نے مجھ کو لکھا کہ:

''حافظ صاحب مرحوم، مغفور کے مرتبہ فضل وکمال سے واقف ہوں، لکھنؤ میں ایک بار سرسری زیارت بھی کی تھی وضع ولباس کی سادگی سے اس وقت میں بہت متاثر ہوا تھا،

مضمون کسی قدر حذف واختصار کے ساتھ رکھ لیا ہے لیکن راوی کو سرعلی امام کے نام میں کچھ سہو ہو گیا ہے، ان کی ذات سے یہ واقعہ نہایت مستبعد ہے، میں جن علی امام کو جانتا ہوں وہ تو شائستگی، تہذیب، مروت کا ایک پیکر تھے، ان کی ذات سے اس کی توقع تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

خود میرے دل میں بھی سرعلی امام کی بڑی عزت تھی، اپنی مثنوی ''اسرار خودی'' میں علامہ اقبال نے اُن کو اس طرح مخاطب کیا ہے اور میں اس کی معلوم نہیں کتنی بار لذت لے لے کر پڑھ چکا تھا۔

آں امام اے سیدوالا نسب | در امانت فخر اشراف عرب
سلطنت را دیدہ افروز آمدی | عقلِ کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنیٔ بے گانہ | جلوۂ شمع را پروانہ
مرغ فکرم گلستاں دیدہ است | از ریاضِ زندگی گل چیدہ است
ایں گل از نارِ رگِ جاں پسندام | تازہ تر در دستِ تو گلدستہ ام
نذر اشک بے قرار من پذیر | گریۂ بے اختیار من پذیر

ان کی زندگی کا یہ واقعہ بھی میرے ذہن میں تھا کہ وہ لندن کے سفر سے واپس آرہے تھے تو بحرِ عرب کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، اگر چہ ان کو اپنی زندگی میں حج کی سعادت نصیب نہیں ہوئی اور اس سے محروم رہ گئے لیکن ارضِ حرم سے ان کو والہانہ شیفتگی تھی، وہ سچے مسلمان بلکہ عاشقِ رسولؐ تھے، پھر بھی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کی زندگی کسی منزل میں شاید اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا ہو اور راوی نے واقدی کی طرح گرمیٔ مجلس کے لئے اس کو ایک افسانہ بنا دیا ہو لیکن اس کو منظر عام پر آنا ضرور چاہئے۔ میں ''صدق جدید'' میں مولانا کی ترمیم واصلاح واختصار کے بعد اس کی اشاعت کا انتظار ہی کرتا رہ گیا لیکن وہ مضمون مولانا کے فائل ہی میں پڑا رہ گیا اور شائع نہیں ہوا۔ میں نے ادباً اس کی یاد دہانی بھی نہیں کی۔

''صدق'' میں اس کی اشاعت کی طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد اس کو ازسر نو لکھ کر

"الاعتصام" لاہور میں بھیجا اور آخر میں مولانا مختار احمد ندوی کو توجہ دلائی کہ مولانا عبدالماجد کے اِن تاثرات کو سامنے رکھ کر اس واقعہ کی صحت پر مزید روشنی ڈالیں، اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی ۲؍نومبر کی اشاعت میں شائع کیا، مولانا مختار احمد ندوی کی نظر سے میرا یہ مضمون ضرور گذرا ہوگا لیکن انھوں نے اس واقعہ پر مزید روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔

وہ واقعہ مختصر یہ ہے کہ جب حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا ابراہیم صاحب آروی کے قائم کردہ مدرسہ احمدیہ آرہ کی مسند صدارت پر فائز تھے تو رفتہ رفتہ آپ کا حلقۂ درس اتنا وسیع ہوگیا کہ اس میں شرکت کے لئے اس صوبہ کے ہر ہر گوشہ سے شائقین وطالبین علم حدیث آنے لگے، یہاں تک کہ اس کا آوازۂ شہرت آرہ سے نکل کر بہار کے اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ حلقہ تک پہنچ گیا اور وہ بھی استفادہ کے لئے آنے لگے، جن میں سے ایک اس دور کے مشہور ملی وقومی قائد مسٹر مظہر الحق بھی تھے جن کی پریکٹس اور ان کی ملی سرگرمیوں کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی، کانپور کی مسجد کی شہادت کے واقعہ فاجعہ کے سلسلے میں ان کا نام ایک ایک بچے کی زبان پر تھا، دوسرے یہی مذکورہ بالا سر علی امام تھے، جو اس وقت وائسرائے ہند کی کونسل کے تنہا ہندوستانی رکن تھے، ان کو حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری کے حلقۂ درس میں شرکت کی خواہش پیدا ہوئی تو مولانا مختار احمد ندوی کی روایت کی بنا پر ان کے اندر تقدس کو پہلے آزمانا چاہا اور ان کو خط لکھ کر پٹنہ میں اپنی کوٹھی پر بلایا حافظ صاحب بایں جلالت، علم وشہرت بے تکلف ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے لیکن سر علی امام محض ان کو آزمانے کے لئے بہت ہی بے رُخی وبے اعتنائی کے ساتھ پیش آئے، اور بغیر ان سے کچھ گفتگو کئے ہوئے واپس کردیا، میزبان کی اس کج زنی سے ذرہ بھی حافظ صاحب کے دل میں ملال نہیں پیدا ہوا، حافظ صاحب موصوف مدرسہ احمدیہ آرہ میں حسب معمول درس وتدریس میں مصروف تھے کہ ایک دن پھر انہی سر علی امام کا خط آیا کہ:

> "ہمیں نہایت شرم وندامت ہے کہ آپ ہمارے یہاں بہ نفس نفیس تشریف لائے لیکن بدقسمتی سے ہم آپ سے فیض حاصل نہ کرسکے، آپ مہربانی کرکے ایک بار پٹنہ آنے کی اور زحمت فرمائیں، اور ہمیں اِستفادہ کا موقع عنایت فرمائیں۔"

دوسرا کوئی ہوتا تو اس کھلے ہوئے مذاق پر خط چاک کرکے پھینک دیتا لیکن آپ پھر کتاب وسنت کی دعوت وتبلیغ کا داعیہ لے کر پٹنہ روانہ ہوگئے کہ شاید ان کا بلانے والا اب خدا اور اس کے رسول کا پیغام ان کی زبان سے سن لے اور ہدایت یاب ہوجائے، ایسے ہی ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے بارے میں فرمایا تھا:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَایَعْلَمُوْنَ

اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ نہ صرف آپ کی قوم جس کی ہدایت کے لئے آپ نے دعا فرمائی تھی بلکہ پورا عرب مسلمان ہوگیا، یہی جذبہ شوق تبلیغ حافظ صاحب کو کھینچ کر اسی آستانہ کبر ونخوت پر لے گیا جہاں سے نہایت بداخلاقی، بے رخی اور بے اعتنائی سے ٹھکرائے جاچکے تھے۔

اب کی مرتبہ پٹنہ اسٹشن پر بایں سادگی وضع ولباس پہنچے تو ان کا استقبال کرنے کے لئے معززین، وعمائدین شہر کا ایک جم غفیر موجود تھا تو حافظ صاحب کو اس درویشانہ لباس میں دیکھ کر ان سب لوگوں پر رقت طاری ہوگئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور سر علی امام کا تو بہت برا حال تھا، نہایت لجاجت اور عاجزی کے ساتھ اپنی گذشتہ گستاخی اور کج رُخی کی معافی چاہی اور بڑے ادب واحترام کے ساتھ اپنی شاندار کوٹھی پر لائے اور دل جوئی وخاطر مدارات کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور عرض کیا:

> ”ہم نے کتابوں میں علمائے سلف کے اخلاق وحسنات کے متعلق بہت سے حیرت انگیز واقعات پڑھے تھے، آپ کے اتباع کتاب وسنت کا شہرہ بھی ہمارے کانوں تک پہنچا تھا لیکن ہم کو کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ اس زمانہ کا کوئی عالم اتباع سنت میں علمائے سلف کے معیار پر اتر سکتا ہے، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ آپ اس معیار پر پورے اترے اور ہم نے آپ کو اپنے تصور وخیال سے کہیں زیادہ بااخلاق اور بزرگی وشرافت کا نمونہ پایا اور ہم آپ کی پیروی واتباع کو اپنے لئے ذریعہ نجات ومایۂ خیر وبرکت سمجھتے ہیں۔“

اس کے بعد امام بخاری وقت کو بصد اجلال واکرام واعزاز رخصت کیا اور پھر ان کے

حلقۂ درس میں اور معززین کی طرح باقاعدہ شریک ہونے لگے۔

سر علی امام کی نسبت سے جن کی اسلام دوستی دردمندی، دلسوزی، رقیق القلبی سے سارا زمانہ واقف ہے اور اقبال جیسا شاعر جن کا مداح ہو یہ واقعہ درایۃً واقعی محل نظر معلوم ہوتا ہے کیا عجب ہے کہ ان کے بجائے اسی صوبہ بہار کا اسی شہرت کا کوئی اور جدید تعلیم یافتہ شخص رہا ہو، اور اس نے حافظ صاحب کے زہد وتقدس نیکی وپارسائی کو آزمانے کے لئے یہ جسارت کی ہو اور حافظ صاحب نے اس کو دین کی راہ پر لانے کی خاطر یہ مذاق گوارا کرلیا ہو۔

مولانا مختار احمد ندوی سے میں درخواست کرتا ہوں کہ اپنے اس بیان کردہ واقعہ پر دوبارہ روشنی ڈالیں لیکن ایسا نہ ہو کہ یہ مشکوک واقعہ حافظ صاحب کی سوانح عمری میں آجائے اور کتاب تنقید کی ہدف بن جائے۔

میرا خط عبدالماجد دریابادی کے نام

معارف کے مستقل مضمون نگاروں میں ایک مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے مدرسہ امینیہ کے فاضل اور ان کے خاص شاگرد مولانا تقی امینی ہیں یہ آپ ہی کے ضلع بارہ بنکی کے ایک قصبہ صبیحہ کے رہنے والے اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سنّی دینیات کے ناظم ہیں، ان سے پہلے اس عہدہ پر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اڈیٹر ماہنامہ ''برہان'' دہلی فائز تھے، انہی کے عہد میں وہاں کے متعدد طلبہ نے اسی شعبہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، بہت ہی بااختیار وباوقار عہدہ ہے جس کا اسٹاف ۴۰ آدمیوں پر مشتمل ہے، وہاں کے مختلف ہوسٹلوں میں نماز کا جو اہتمام ہے اس سے ائمہ اور موذنین کے تقرر اور عزل کا تعلق اسی سے ہے، مولانا اکبرآبادی کے بعد انہی صاحب کا تقرر ہوا ہے، ان کی فقہ وحدیث پر بڑی اچھی نظر ہے، کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن کو ندوۃ المصنفین دہلی نے بہت اہتمام سے شائع کیا ہے، یہ دارالمصنفین کی پچاس سالہ گولڈن جوبلی میں شرکت کے لئے آئے تھے، آپ سے شاہ صاحب نے ان کا بحیثیت ایک دینی عالم، مصنف اور معارف کے

مستقل مضمون نگار کے کیا عجب ہے کہ تعارف کرایا ہو یا ان سے ''معارف'' اور ''برہان'' میں ان کے بلند پایہ مضامین کے ذریعہ آپ پہلے سے واقف رہے ہوں، ان سے میرا ان کے ''معارف'' مضامین کے ذریعہ ایک عرصہ سے غائبانہ تعارف تھا، مولانا مجیب اللہ ندوی نے اس تقریب کے سلسلہ میں میرا ان سے تعارف کرایا لیکن اس وقت انھوں نے میری طرف چنداں اعتنا نہیں کیا لیکن میں ان کی ذہانت اور متحرک شخصیت سے متاثر ضرور ہوا، وہ پارسال کی گرمیوں میں مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مئوی کے یہاں سے ہوتے ہوئے شاہ صاحب سے ملاقات کرنے اور ''معارف'' میں اپنے ایک زیر طبع مضمون کی تکمیل کے سلسلہ میں حدیث کی بعض کتابوں کی مراجعت کے لئے دارالمصنفین بھی آئے تھے، جمعہ کا دِن تھا میں حسب معمول جمعہ کو صبح کے وقت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے بغیر کسی تعارف کے کھڑے کھڑے کتب خانہ سے استفادہ کے لئے ان کو میرے ساتھ کر دیا، جہاں کئی گھنٹہ تک میرا ان سے سابقہ رہا، حدیث اور متعلقات حدیث کی کتابیں جو ان کو مطلوب تھیں، ڈھونڈ ڈھونڈ کر الماریوں سے ان کے لئے نکالتا رہا اور وہ ان سے اپنے مفید مطلب اقتباسات نقل کرتے رہے اس درمیان میں وہ مجھ سے اپنے اعلیٰ اخلاق کی بنا پر ایسا گھل مِل گئے کہ گویا ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت پرانے ملاقاتی ہیں، شاہ صاحب نے بھی ان کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، کھانے کا وقت ہوا تو ان کو لینے کے لئے خود بنفس نفیس کتب خانہ میں آئے اور اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لئے اپنے کمرے میں لیوا گئے، اسی درمیان میں کسی نہج سے میری اہلحدیثیت کا ذکر آ گیا جس کا حسب معمول شاہ صاحب نے میرا خوب مذاق اڑایا اور فرمایا کہ یہ محض نام کے اہل حدیث ہیں لیکن اپنی زندگی اور مذاق کے لحاظ سے اہلحدیثیت سے ان کا دور و قریب کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سن کر مولانا محمد تقی بہت محظوظ ہوئے، جمعہ پڑھ کر میں گھر چلا گیا اور ان سے پھر نیاز حاصل نہ کر سکا، دوسرے دن حسب معمول کتب خانہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی جمعہ بعد مئو واپس چلے گئے، ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہونے کا کئی دن تک افسوس رہا، شاہ صاحب کتب خانہ میں داخل ہوتے ہی میرے پاس آئے اور فرمایا کہ یہ پہلے ندوہ کی مجلس تحقیقات ونشریات میں بھی کچھ دن رہ چکے ہیں، لکھنے پڑھنے کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں ردولی کے قریب ہی ایک قصبہ

صبیحہ کے رہنے والے ہیں وہاں کے کئی مشاہیر علم وفن کا بھی ذکر کیا، مولانا ابوالحسن علی سے تو ان کی نہیں بیٹھ سکی لیکن مجھ سے بڑا تعلق رکھتے ہیں اور میں بھی ان کی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر ان کا بڑا قدرداں ہوں، شاہ صاحب کا انتقال ہوا تو جہاں میں نے اور بہت سے لوگوں مثلاً ابوالحسن علی ندوی عبدالرزاق قریشی اڈیٹر ''نوائے ادب'' بمبئی نواب عبیدالرحمٰن خاں شیروانی ٹریزرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی کو تعزیتی خط لکھے، ایک خط میں نے ان کی ذات خاص کے ساتھ غیر معمولی تعلق کی بنا پر جس کا ذکر خود شاہ صاحب نے مجھ سے ان کے یہاں سے جانے کے بعد کیا تھا ان کو بھی لکھا جب خط پورا ہو گیا تو خیال ہوا کہ یہ ان کے ذاتی پندرہ روزہ اخبار ''احتساب'' میں بھی شائع ہو جاتا تو اس کے حلقہ کے لوگ بھی شاہ صاحب کی شخصیت سے واقف ہو جاتے، میں نے آخر میں لکھ دیا کہ اگر آپ اپنے اخبار کی کسی اشاعت میں بھی جگہ دے دیں تو آپ کا بہت شکر گذار ہوں گا لیکن اگر کسی وجہ سے جگہ نہ دے سکیں تو مجھے قطعی ملال نہ ہوگا، انھوں نے فوراً میرے اس مراسلے کے جواب میں لکھا کہ:

> مراسلہ بہت لمبا ہے اور اس میں بعض باتیں ایسی بھی آگئی ہیں جو آپ کے لئے شاید مصلحت کے خلاف ہوں اس لئے ان کو حذف کرنے کے بعد مراسلہ انشاء اللہ شائع ہو جائے گا۔''

اس وقت مجھے شبہ ہوا کہ روانیِ قلم میں کچھ باتیں خلاف مصلحت بھی میرے قلم سے غیر شعوری طور پر نکل گئی ہیں، میں نے ان کی خیر خواہی اور مصلحت بینی پر پورا اعتماد کر لیا، میں نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا اور خیال کیا کہ اس میں جو باتیں خلاف مصلحت ہوں گی وہ انشاء اللہ اپنی صواب دید سے خود ہی نکال دیں گے اور پھر میں اس سے خالی الذہن بھی ہو گیا، ایک عرصہ کے بعد وہ مراسلہ مولانا محمد تقی امینی کے اخلاص ومحبت میں ڈوبے ہوئے نوٹ کے ساتھ ''احتساب'' میں چھپ کر آیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ''تعمیر حیات'' کے شاہ معین الدین نمبر کے بعد میرا ایک اور مضمون شاہ صاحب پر اس اخبار میں بھی آگیا اور اس کو بھی لوگ لطف ولذت کے ساتھ پڑھیں گے اور مجھ کو داد دیں گے، اس سرور وکیف کے عالم میں اس کو پڑھنے کے لئے گھر لے گیا اور کئی بار پڑھا

اور میں اپنے طور پر بالکل مطمئن ہو گیا لیکن بعض بزرگوں کو میرا یہ اخلاص ومحبت وعقیدت میں ڈوبا ہوا مضمون حیرت انگیز طور پر پسند نہیں آیا کہ اس میں شاہ صاحب کے معاملہ سے کہیں زیادہ ان کی علمی وتصنیفی زندگی پر شدید تنقید ہے جس سے ان کی شخصیت کے مجروح ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اور اس پر ایک عرصہ تک ان کا ہدف ملامت بنا رہا لیکن عام طور سے تعمیر حیات کے مضمون کی طرح میرا یہ تاثراتی خط یا مضمون بھی لوگوں کو بہت پسند آیا اور کسی کو بھی اس میں کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آئی۔

میرا ایک اور خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

شاہ معین الدین صاحب کے ادبی تنقیدی مضامین کا مجموعہ فروغ اردو لکھنؤ سے چھپ کر آیا تو کچھ ہی دنوں کے بعد شاہ صاحب کی ہی زبانی معلوم ہوا کہ خواجہ احمد فاروقی صاحب کی تصنیف ''میر تقی میر'' دہلی یونیورسٹی کے نصاب اردو میں داخل کر لی گئی تو مجھے معاً خیال آیا کہ آپ نے بھی اپنی زندگی کے دورِ اول میں بہت سارے ادبی وتنقیدی مضامین اردو کے مختلف بلند پایہ رسالوں میں لکھے تھے خاص طور سے اکبر الہ آبادی پر جو طویل مضمون آپ نے انجمن ترقی اردو کے رسالہ ''اردو'' میں لکھا تھا وہ زیادہ یاد آ رہا تھا کیوں نہ ان کا مجموعہ چھاپا جائے اور یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل کیا جائے۔ یہ بات اب تک میرے دل ہی میں تھی کہ کتب خانہ میں ایک صاحب کی میز پر ''انشائے ماجد'' کے نام سے آپ کے ادبی نوشتوں کا مجموعہ نظر آیا، بے اختیار میں اس کی طرف لپکا اور اٹھا کر اپنے کمرے میں لایا دیباچہ پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس طرح کے مضامین کا ایک مجموعہ اسی نام سے آج سے برسوں پہلے نہ صرف شائع ہو چکا ہے بلکہ اس کے دو اڈیشن نکل بھی چکے ہیں اور وہ بحمد اللہ بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل بھی ہے، اور بحمد اللہ تیسری جلد کے لئے بھی سامان فراہم ہو چکا ہے یہ پرستاران ''انشائے ماجد'' کے لئے بڑی مسرت کی بات ہے، خدا کرے موخر الذکر جلد بھی جلد سے جلد منظر عام پر آ جائے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اکبر اور ان کی شاعری

والا مضمون پہلی جلد میں آچکا ہے، یہ مضمون جب رسالہ ''اردو'' میں چھپا تھا بہت پسند آیا تھا، اس لئے میں نے خوب لذت لے لے کر پڑھا تھا، اس کی داد مجھ ایسا کم سواد کیا دے سکتا ہے۔

اس مجموعہ میں ''چند نثریئے'' کے عنوان کے تحت جو دو مضمون 'محمد علی' اور 'محمد علی کے خطوط' کے عنوان سے ہیں، کیا وہ 'محمد علی ذاتی ڈائری' میں شائع ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کے مرتب ہو جانے کے بعد لکھے گئے ہیں، اس مجموعہ کے سارے مضمون ماشاء اللہ بہت ہلکے پھلکے اور دلچسپ ہیں بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔

اس میں چند مراثی بھی ہیں جن کے متعلق میری عرصہ سے ایک رائے ہے کہ جس طرح سید صاحب نے اس طرح کے مضامین کا مجموعہ بکثرت اضافوں کے ساتھ ''یادرفتگاں'' کے نام سے شائع کیا ہے آپ کے اس طرح کے مضامین ومراثی کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو جائے ''صدق'' کے گذشتہ فائل اس طرح کے مضامین اور اداریوں سے بھرے ہوئے ہیں، صرف ان کو اکٹھا کر لینا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ فکر آپ کی قرآنی سیرت کے طبع واشاعت کی ہے میں تو اس کو یہیں کے سلسلۂ سیرت النبیؐ کی ایک کڑی سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جس طرح اس سلسلہ کی چھ جلدیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں اسی اہتمام کے ساتھ یہ بھی یہیں سے شائع ہو، یہ اگر ممکن نہ ہو تو کم سے کم میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ خود چھپوائیں یا کوئی اور ناشر چھاپے مگر اس کی تقطیع یہی ہوتا کہ وہ باطناً وظاہراً ہر اعتبار سے اسی سلسلہ کی کڑی معلوم ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے یاد دلانے سے اپنی سیرت کی تالیف کے دوران میں خود مولانا شبلی کو بھی قرآن کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح وحالات مرتب کرنے کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور اس کو وہ بطور ایک باب کے اپنی سیرت النبیؐ میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے مگر پھر یہ خیال ان کے دل سے نکل گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کی قرآن کی اردو تفسیر چھپ گئی اور شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی فکر سے نجات دے دی، ورنہ تاج کمپنی لاہور نے اس کے طبع

واشاعت کی جو رفتار رکھی تھی اس کے لئے تو اس کے لئے عمر نوح بھی کافی نہیں ہوسکتی تھی، وہ زبان واسلوب بیان کے علاوہ جدید معلومات کے لحاظ سے بھی اردو میں قرآن کی بہترین تفسیر ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ اس سے زیادہ جامع اور مذاق حال کے مطابق کوئی تفسیر اردو میں نہیں ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کا مطالب ومعانی کے لحاظ سے جو بھی درجہ ہو اور آپ نے اپنی اس تفسیر میں اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے لیکن معمولی اردو خواں اس سے مستفید نہیں ہو سکتے، موجودہ اور آئندہ نسل کے لئے آپ ہی کی تفسیر کارآمد ہے۔

اس مجموعہ میں مراثی کے ذیل میں ایک مضمون مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم پر ہے جس کو میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا اور پڑھ کر بے اختیار ان کی یاد تازہ ہوگئی، میرا ان سے سرائے میر کی طالب علمی کے زمانہ میں شاگردی واستادی کا پھر کلکتہ میں ایک دوست کی حیثیت سے تعلق رہا ہے، وہ جب تک کلکتہ میں رہے میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، بلکہ بعد نماز عشاء سنٹرل اوینو روڈ پر ان کے ساتھ چہل قدمی بھی کرتا رہا اس چہل قدمی کے دوران ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ میں مولانا ابوالکلام کو کچھ یوں ہی سا سمجھتا تھا لیکن میں ایک روز محض امتحان کی غرض سے اپنے ذہن میں چند سوالات مرتب کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انھوں نے میرے ہر سوال کا بہت تسلی بخش جواب دیا، تمام علوم دینیہ پر ان کی گہری نظر ہے، ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے اور حافظہ تو بلا کا ہے، ہر فن پر وہ ماہرانہ گفتگو کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ، وہ سرائے میر میں مجھ پر بے حد مہربان تھے، بلکہ ایک عزیز کی طرح مانتے تھے اور میری تعلیم وتربیت سے بڑی دلچسپی لیتے تھے اور میری صلاحیتوں کے اُجاگر کرنے میں بڑی کوششیں کرتے تھے اور انھوں نے مجھ سے بڑی توقعات قائم کرلی تھیں، لیکن افسوس کہ ۱۹۱۸ء میں اپنے والد کی وفات کی وجہ سے میری عربی تعلیم نامکمل رہ گئی اور میں اپنے شفیق مہربان استاد کی توقعات پوری نہ کرسکا، جس کا مجھ کو ہمیشہ غم رہے گا۔

(یہ خط اکتوبر ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا)

☆☆☆

میرا ایک اور خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام
مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سوانح عمری سے متعلق

اِدھر اردو رسالوں کے جو شخصیات نمبر نکلے ہیں ان میں معارف کے سلیمان نمبر کا کیا درجہ ہے اس کا فیصلہ تو اصحاب علم اور ارباب نقد ونظر ہی کر سکتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے مضامین اپنی جگہ پر بڑے، وقیع بلند پایہ اور پڑھنے کے قابل ہیں اور ان کے لکھنے والے بھی ملک کے مشہور ادیب، انشا پرداز، اہل قلم اور مصنف ہیں جن کا شمار خود بھی علم وادب اور زبان کی اہم شخصیتوں میں ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ان گونا گوں خوبیوں کے باوجود سیرتِ سلیمانی کا بدل نہیں ہو سکتا۔

سید صاحب مولانا شبلی کی طرح گو (genious) نہ رہے ہوں لیکن اپنے دور کی ایک اہم شخصیت ضرور تھے، جن پر بلاارادہ ہر شخص کی نظر پڑتی تھی، اور وہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا، ان کا گاڑھے کا سفید صافہ، برق دم شیروانی، نورانی چہرہ، زیرِ لب تبسم، سنجیدہ ظرافت ہر چیز بڑی پرکشش تھی، جلسوں اور انجمنوں میں تو اپنی منفرد سج دھج سے پورے مجمع کا مرکزِ نگاہ بن جاتے تھے، تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو حقائق ومعارف کا ایک دریا بہا دیتے تھے، تاریخی وجغرافیائی معلومات کے لحاظ سے علما کے طبقہ میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا، سیرت ان کا خاص موضوع تھا اور اس موضوع پر جب بولتے تھے تو ایمان تازہ ہو جاتا تھا، ''خطبات مدراس'' اس فن میں ان کے غور وفکر کی ایک زندہ مثال ہے، جس کو پڑھ کر سیکڑوں خطیب مقرر اور اہل قلم ہو گئے، ان کی ہر کتاب اتنی زیادہ تحقیقی ہوتی تھی جس پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی تھی، اتنی ہی فیض بخش بھی ہوتی تھی ان کی کتابوں کو پڑھ کر کتنے ملحد خدا آگاہ، کتنے گمراہ ہدایت یاب اور کتنے مذہب ناشناس مذہب کے

دلدادہ ہوگئے، اس حیثیت سے وہ اردو کے مقبول ترین مصنف تھے، ان کی ہر کتاب کا علماء محققین اور خواص امت نے پرزور خیر مقدم کیا اور شوق وعقیدت کی آنکھوں سے پڑھا، وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ندوۃ العلماء کا جلسہ ہو، یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس، خلافت کانفرنس ہو یا جمعیۃ العلماء ہند کی مقدس مجلس ہندوستان اکاڈمی ہو یا انجمن ترقی اردو ارباب جبہ ودستار کا مجمع ہو، یا پینٹ پتلون والوں کی محفل، ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے، کانگریس کے آل انڈیا اجلاس احمد آباد میں پہلی مرتبہ شریک ہوئے تو گاندھی جی تک مسحور ہوگئے، اور بے اختیار ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا کہ:

"یہ مولوی تو بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

اور ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنالیا۔

ایسے جامع کمالات وجامع حیثیات بزرگ کی سوانح عمری کی تالیف اردو کے ہر صاحب قلم کا فریضہ ہے جس سے اس کا عہدہ برآ ہونا ضروری ہے، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ حلقہ معارف یا ندوہ ہی کا کوئی شخص ہو علم وفن، فضل وکمال، صلاحیت وقابلیت کسی جماعت اور کسی فرد کی تنہا میراث نہیں ہے اور نہ سید صاحب اپنے گوناگوں کمالات اور بوقلموں حیثیات اور فکر ونظر کی وسعت کے لحاظ سے کسی ایک حلقہ اور جماعت کے آدمی تھے اس لئے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، سوانح نگاری کے لئے مولانا شبلی اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کا اسلوب تحریر بہت موزوں ہے جن اصحاب قلم نے سلیمان نمبر کی ترتیب وتکمیل میں حصہ لیا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ اب ان میں اس کام کی سب سے زیادہ صلاحیت کس میں ہے۔

مرحوم سے آپ کے جو طویل اور گہرے تعلقات تھے اس سے کون واقف نہیں ہے، "سید الطائفہ" کا خطاب تو آپ ہی کا بخشا ہوا ہے، معلوم نہیں ان تعلقات کے کتنے نقوش آپ کے دل ودماغ پر مرتسم ہوں گے۔ کاش کہ "حکیم الامت" اور "محمد علی ذاتی ڈائری" کی طرح یہ نقوش اخلاص ومحبت بھی صفحہ قرطاس پر آجائے، آپ دونوں صاحب علم بزرگوں کے گوناگوں تعلقات کی مفصل داستان سننے کے لئے ہر اہل ذوق بے چین ہے، اگر یہ داستان مکمل ہوگئی تو اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک بیش قیمت چیز کا اضافہ ہوگا، امید ہے کہ آپ اپنی اولین فرصت میں اس کی طرف

توجہ فرما کر اپنے بے شمار قدر دانوں اور نیاز مندوں کو ممنون فرمائیں گے۔

حکیم الامت آپ کے مرشد اور روحانی معلم تھے اور مولانا محمد علی آپ کے ممدوح و محبوب لیکن سید صاحب آپ کے برابر کے دوست اور ہم عصر تھے اور شدتِ ہم ذوقی نے دونوں کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ دونوں تعلیم، صلاحیت اور ذوق کے اعتبار سے ایک ہی اسکول اور مکتب فکر کے آدمی معلوم ہوتے تھے، اگر آپ ان کے علم وکمال کے معترف تھے تو وہ آپ کے ادب وانشاء اور رعنائی قلم اور حسنِ تحریر کے قائل تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا جواب

سید صاحب کی مکمل و مفصل سوانح عمری کی ضرورت سے کسی کو بھی انکار نہیں، سوال یہ رہ جاتا ہے کہ لکھے کون، اس کے لئے بھی قرعہ انتخاب مولوی شاہ معین الدین ندوی اڈیٹر معارف پر عرصہ ہوا کہ پڑ چکا ہے اور لوگوں کے ساتھ بے بضاعت مدیر ''صدق جدید'' بھی ترتیب وتالیف میں شرکت اور صلاح ومشورہ کی حد تک ہر خدمت کے لئے تیار ہے۔

عبدالماجد

''صدق جدید'' ۲۵ر جنوری ۱۹۵۷ء

حیاتِ سلیمان کی ترتیب وتالیف میں صلاح ومشورہ ہی کی حد تک مولانا دریابادی کی کیا خدمت رہی ہے اس کا علم نہیں ہوسکا، اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ جستہ جستہ اس کتاب کا مسودہ ڈاک کے ذریعہ مولانا شاہ معین الدین ندوی مولانا کی خدمت میں برابر بھیجتے رہے اور ان کے یہاں سے واپس آنے کے بعد کتابت کے لئے پریس میں بھیجتے تھے مگر تصحیح ومقابلہ کے وقت پورے مسودہ میں کہیں بھی اصلاح کا کوئی نشان نظر نہیں آیا اگر اس کے متعلق بجائے مسودہ میں کچھ بنانے کے خط کے ذریعہ اپنے مشورے پیش کرتے رہے ہوں اور ہدایات دیتے ہوں تو اس کا ہمیں علم نہیں ہوسکا مگر حیرت انگیز طور پر ''حیات سلیمان'' پر تبصرہ محض دو تین سطروں کا ہے۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام میرا ایک اور خط

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ پر میرے ہفوات ''صدق'' میں آگئے، اس کرم فرمائی کے لئے صدق دل سے شکرگذار ہوں

''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' کی پہلی جلد پر لکھنؤ کے وحید مرزا کا جو طویل تبصرہ حیدرآباد کے اسلامک کلچر میں شائع ہوا ہے اس پر آپ کے شدید تاثرات کا علم صباح الدین صاحب کے ذریعہ ہوا بلکہ انھوں نے مجھے آپ کا وہ خط بھی دکھایا جو اس سلسلہ میں آپ نے ان کو لکھا تھا یقیناً اس ادارہ کے مصنفین و رفقاء کے نگراں کی حیثیت سے آپ کے دل و دماغ کو اتنی ہی اذیت پہنچنی چاہئے بھی تھی جو پہنچی۔ یہ کتاب جس رواروی میں چھپی اور شائع ہوئی اس کا نتیجہ یہی ہونا بھی چاہئے تھا کہ اس میں اتنی زیادہ غلطیاں رہ گئیں جن پر مترجم اور نگراں کسی کی بھی نظر نہیں پڑی، اس سے دارالمصنفین کی سخت بدنامی ہوئی، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اب اس کی تلافی کی کیا صورت ہے، دوسری جلد بھی اسی طرح رواروی میں چھپی ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں ترجمہ وتفسیر کی کتنی غلطیاں ہوں گی۔ اس میں اس ادارہ کے سینئر رفیق مولوی مجیب اللہ صاحب بھی شریک رہے ہیں جن کی اور لوگوں کے مقابلہ میں عربی پر اچھی نظر ہے۔

مجھے کچھ دنوں سے موجودہ عربی مدارس کے فارغین کی عربی دانی کی طرف سے بڑی سوء ظنی پیدا ہوگئی ہے، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ۹/۱۰ سال تک عربی پڑھنے اور پڑھانے سے آخر فائدہ کیا ہے جب کہ عربی پڑھنے والوں کی اکثریت کو نہ عربی لکھنا آتا ہے نہ عربی بولنا آتا ہے اور گستاخی معاف اب تو اِن کے عربی سمجھنے کی طرف سے بھی سوء ظنی پیدا ہو رہی ہے، اتنا بڑا عظیم الشان ملک

اور عربی بولنے اور لکھنے والے انگلیوں پر گنے جائیں، یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کا کتنا بڑا المیہ ہے، میری رائے ہے کہ یا تو یہ سارے عربی مدارس ختم کر دیے جائیں یا جاری رہیں تو عربی کی تعلیم پوری ذمہ داری کے ساتھ ہو، اگر ان کا مقصود دین کا سیکھنا اور سکھانا ہے تو یہ کام اردو سے بھی ہوسکتا ہے، فقہ وحدیث کا تقریباً سارا ذخیرہ اردو میں منتقل ہوگیا ہے، اس کو پڑھ کر آدمی اچھا خاصا عالم اور مسئلہ مسائل پر حاوی ہوسکتا ہے اور اگر دین کی تعلیم عربی ہی کے ذریعہ ضروری ہے تو اس کے لئے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو عرب ممالک کی دینی ودنیاوی درسگاہوں میں رائج ہے کہ تمام علوم کی تعلیم عربی زبان میں دی جائے بغیر اس کے عربی میں ممارست اور مہارت پیدا نہیں ہوسکتی۔

مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری کے نام میرا ایک خط

مکتوب مولانا محمد علی پر میں نے جو حواشی وتعلیقات لکھے تھے معلوم نہیں کس مصلحت سے صاحب ''صدق'' نے بہت مختصر کر دیے اور اس وجہ سے وہ کچھ بے جان سے ہوگئے، میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ان پر کسی صاحب نظر کی نظر پڑسکتی ہے، میرے لئے یہ انتہائی فخر ومسرت کی بات ہے کہ آپ کی توجہ عالی ان کی طرف مبذول ہوگئی اور آپ نے نہ صرف ان کو پسند فرمایا بلکہ اپنے مکرمت نامہ کے ذریعہ مجھے ان قلم برداشتہ سطروں کی داد بھی دی، اس قدر افزائی ذرہ نوازی اور حوصلہ افزائی کے لئے آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں، مولانا محمد علی پر تو اس سے پہلے میرے ہفوات کی کئی قسطیں مختلف اوقات میں ''فاران'' کراچی۔ ''صدق جدید'' لکھنؤ۔ ''ادیب'' علی گڑھ میں شائع ہوچکی ہیں اور وہ آپ کی نظر سے بھی گذری ہوں گی۔

یہ مکتوب میرے شبلی منزل کی میز کی دراز میں کاغذات کے انبار میں نامعلوم مدت سے دبا پڑا تھا جس کا مجھ کو خیال بھی نہیں تھا ایک روز اپنی میز کے دراز کا جائزہ لے رہا تھا تو حسنِ اتفاق اس پر نظر پڑگئی، اس کا قدرداں اس دور میں ماجد میاں سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے میں نے اس پر کچھ

حواشی لکھ کر ''صدق جدید'' میں چھپنے کے لئے بھیج دیا خیال تھا کہ جوں کا توں شائع ہو جائے گا اس میں ادارہ کی طرف سے کوئی ترمیم واصلاح اور حذف واضافہ نہ ہوگا، ترمیم تو بلاشبہ نہیں ہوئی لیکن میرے بہت سے حواشی حذف کر دیے گئے، اس پر مجھے کوئی رنج بھی نہیں ہوا، میں ان کو اپنا مخلص مربی اور بزرگ سمجھتا ہوں، مجلس انتظامیہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے شبلی منزل میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے میری خیریت دریافت کرتے اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے ہیں، ان کی ''مکتوبات سلیمانی'' کی اشاعت پر ایک زمانہ میں ان کے خلاف دارالمصنفین میں بڑا ہنگامہ برپا تھا، اس میں، میں ان کا سو فیصدی حامی تھا، میں نے اس کی حمایت میں ان کو جو خط لکھا تھا وہ انھوں نے ازراہِ قدردانی ''صدق جدید'' میں شائع کر دیا تھا اس پر مجھے یہاں بہت معتوب ہونا پڑا مگر ع:

رسیدہ بود بلائے وَلے بخیر گذشت

دارالمصنفین میں اور پھر پورے ملک میں اپنے خلاف فضا پیدا کرنے میں خود مولانا ہی کو دخل تھا۔ ان مکاتیب پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا تھا اس میں انھوں نے مکاتیب کی اشاعت پر خود ہی تذبذب کا اظہار کیا تھا، وہی ان کے لئے مصیبت بن گیا، ان کے خلاف اخبارات میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا، اس معاملہ میں میری پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی اور سمجھتا تھا کہ انھوں نے یہ خطوط شائع کر کے اردو کے خزانہ ادب میں بہت اچھا اضافہ کیا ہے۔ ''حیاتِ سلیمان'' کی تالیف میں ان مکاتیب سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

ماجد میاں میرے قدر دان تو اس وقت سے ہیں جب میں ہندوستان کے جمہور مسلمانوں کے مطالبہ کی تائید میں ''منشور'' دہلی اور دوسرے اخبارات میں مضمون لکھا کرتا تھا، اس حیثیت سے لکھنؤ میں ان کے دریافت کرنے پر میرا تعارف ان سے مولانا شاہ معین الدین ہی نے کرایا تھا۔

☆☆☆

میرا ایک اور خط جناب عبدالماجد دریابادی کے نام

مجھے سب سے زیادہ فکر آپ کی قرآنی سیرت کے طبع و اشاعت کی ہے، معلوم نہیں آپ نے اس کے متعلق کیا سوچا ہے، میں تو اس کو یہیں کے سلسلۂ سیرت النبیؐ کی ایک کڑی سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جس طرح مولانا شبلی اور ان کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کی چھ جلدیں یہاں سے شائع ہوئی ہیں اسی اہتمام کے ساتھ آپ کے قلم کی یہ سیرت بھی یہیں سے شائع ہو، اگر یہ ممکن ہو تو کم سے کم میں یہ ضرور چاہوں گا کہ آپ خود چھپوائیں یا کوئی اور قدرداں ناشر چھاپے تو اس کی تقطیع یہی ہوتا کہ وہ ظاہراً بھی اسی سلسلہ کی چیز معلوم ہو۔

خدا کا شکر ہے کہ اردو تفسیر ماجدی چھپ گئی اور شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی فکر سے نجات دے دی، ورنہ تاج کمپنی نے اس کی اشاعت کی جو رفتار رکھی تھی اس کے لئے تو عمر نوحؑ بھی کافی نہیں ہوسکتی تھی، وہ زبان و بیان کے علاوہ جدید معلومات کے لحاظ سے بھی اردو میں قرآن کی بہترین تفسیر ہے اور آپ کی علمی زندگی کا بڑا شاندار کارنامہ، مولانا حمید الدین، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام ہی جیسے ماہرین فن تفسیر و رازدانانِ علوم و معارف قرآنی اگر زندہ ہوتے تو اس کی صحیح داد دے سکتے تھے، افسوس کہ یہ تینوں بزرگ دوران طبع ہی میں یکے بعد دیگرے اس دنیا سے اٹھ گئے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ''بیان القرآن'' کا نفس تفسیر اور اس کے مطالب و معانی کے لحاظ سے جو بھی درجہ ہو ایک بڑا درجہ اس کا تو یہی ہے کہ اس تفسیر کے لکھتے وقت وہ برابر آپ کے مطالعہ میں رہی ہے، اور اس سے آپ نے کافی استفادہ بھی کیا ہے لیکن قدیم طرز

واسلوب میں ہونے کی وجہ سے اس کا استفادہ معمولی اردو خواں کے لئے تو سخت مشکل ہے، موجودہ نسل اور آئندہ آنے والی نسل کے لئے آپ ہی کی تفسیر مفید ہو سکتی ہے۔

چند مرثیے کے تحت اس جلد میں ایک مضمون مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم پر ہے، جس کو میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھا، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ان سے میرا شاگردی واستادی کا تعلق رہا ہے میں کیا عرض کروں کہ وہ کیا تھے۔ دنیا بھر کے کمالات اللہ تعالیٰ نے ان میں جمع کردیئے تھے، وہ مفسر، محدث، ادیب، خطیب سب کچھ تھے، ان کا خاص مضمون تو عربی ادب تھا، اسی میں انھوں نے کمال پیدا کیا تھا اور عربی ادب کے استاد ہی کی حیثیت سے ان کا مدرسۃ الاصلاح میں تقرر ہوا تھا لیکن وہ کسی فن کے پڑھانے سے عاری نہیں تھے، جس فن کی بھی کتاب ان کے سپرد ہوجاتی خوب پڑھاتے تھے، مطالعہ کے شائق اور عادی تھے، روزانہ بلا ناغہ ایک محنتی و جفاکش طالب علم کی طرح رات کے بارہ بجے تک کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے کوئی کتاب خواہ کتنی ہی آسان اور سہل الفہم ہوتی، پھر بھی پہلے سے مطالعہ کے بغیر نہیں پڑھاتے تھے۔

ان کے شوق مطالعہ کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ ایک صاحب سیرت نبوی کی پہلی جلد جو ابھی ابھی پریس سے نکلی تھی، دارالمصنفین سے خرید کر واپس جارہے تھے کہ درمیان میں ایک شب کے لئے وہ مدرسۃ الاصلاح میں ٹھہر گئے۔ اس کتاب کا بڑا شہرہ تھا اور جو جتنا ہی مولانا شبلی کا معتقد، ان کا نیازمند اور ان کے زبان وادب کا شیدا تھا، اس کی طبع واشاعت کا منتظر اور مطالعہ کا آرزومند تھا، پھر حضرت نگرامی تو ان کے خاص شاگرد ہی نہیں بلکہ آغوش پروردہ تھے، دین وملت اور علم وفن کے معلوم نہیں کتنے کاموں کے لئے انھوں نے ان کی تربیت کی تھی، ان کو اس کتاب کے دیکھنے کا جتنا بھی شوق رہا ہوگا ظاہر ہے، پھر یہ دولت ان کو گھر بیٹھے حسنِ اتفاق سے ہاتھ آگئی تھی، مئی اور جون کی گرمیوں کا زمانہ تھا، مہمانداری کے سارے فرائض سے عہدہ برآ اور اپنی ذاتی ضروریات سے فارغ ہو، ان سے کتاب لی اور بڑی تقطیع کے چار پانچ سو صفحوں کی ضخیم کتاب مع حواشی وفٹ نوٹ کے صبح تک پڑھ ڈالی۔

مدرسہ کے جن خوش قسمت طلبہ کو ان کی تعلیم وتربیت اور صحبت ومجالست کا شرف حاصل

تھا، ان میں ایک میں بھی تھا، لیکن اسی درمیان میں ۱۹۱۸ء میں میرے والد کا انفلوئنزا میں انتقال ہو گیا اور اپنی عربی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کلکتہ چلا گیا، خوش قسمتی سے کچھ ہی دنوں کے بعد استاذ محترم کی رفاقت وہم نشینی کا شرف پھر حاصل ہو گیا، میں تو کلکتہ میڈیکل کالج کے قریب ایڈن ہاسپٹل روڈ میں اپنے اخیافی چچا منشی عبدالغفور صاحب کے یہاں جو والد کے انتقال کے بعد ہمارے کفیل تھے، رہتا تھا۔ یہ انگریز تامسن کے چمڑے کے گودام کے منیجر اور بیش قرار تنخواہ پاتے تھے، بڑے خدم و حشم کے ساتھ رہتے تھے اور وہ مسجد ناخدا زکریا اسٹریٹ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قائم کردہ مدرسہ میں عربی ادب کے استاد تھے اور اُسی کے قریب سیٹھ موسیٰ کے لق ودق مسافر خانہ کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں رہتے تھے، اس کے بغل کے کمرے میں مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا جو مالٹا سے شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کا ساتھ چھوڑ کر آئے تھے، اور اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے، میں مسجد ناخدا اور مسافر خانہ دونوں جگہ اکثر ان کی زیارت اور ملاقات کے لئے جایا کرتا تھا اور دیر تک ان کے ساتھ رہتا تھا، اسی مسافر خانہ میں جانشین شیخ الہند سے نیاز حاصل ہوا۔ استاد محترم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ میں ان سے آج کل کی عربوں کی زبان سیکھتا ہوں اور وہ مجھ سے اردو لکھنا سیکھتے ہیں اور باوجود سن وسال کے غیر معمولی تفاوت کے ہم دونوں ایک دوسرے کے شاگرد اور استاد ہیں، مولانا حسین احمد ایک مدت تک عرب و مصر میں رہنے کی وجہ سے اردو لکھنا بھول گئے تھے کہ ان کا زیادہ سابقہ ان ملکوں میں عربوں ہی سے تھا اس لئے اردو بولنے اور لکھنے کی نوبت بہت ہی کم آتی تھی، دونوں بزرگ ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے تھے اور ایک دوسرے کی خدمت کے لئے بے چین رہتے تھے۔

عشا بعد ہم دونوں استاد و شاگرد روزانہ سنٹرل اونیو روڈ پر ساتھ ٹہلا کرتے تھے اور مختلف مسائل پر باہم گفتگو اور تبادلہ خیالات کرتے تھے، اسی دوران میں استاد محترم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ میں اب تک مولانا ابوالکلام کو کچھ یوں ہی سا سمجھتا تھا اور بہت زیادہ ان کے علم و قابلیت کا معترف نہیں تھا، لیکن ایک دن اپنے ذہن میں مختلف فنون سے متعلق سوالات مرتب کر کے امتحان کے لئے ان کی خدمت میں گیا تو انھوں نے میرے ہر سوال کا جواب نہایت تشفی بخش دیا ان کے

متعلق جیسا سنتا چلا آرہا تھا ان کو بالکل ویسا ہی پایا، ہر علم میں ان کا استحضار اور قوت حافظہ اسلاف کی طرح نظر آیا۔ (''صدق جدید'' کے شمارہ ۲۵ راگست ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط

میرے خط کے جواب میں

سیرۃ نبوی قرآنی کے وہ لکچر تو افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کی تحریک پر مدراس یونیورسٹی کی زیر سرپرستی ایک انجمن اسلامیہ کے زیر اہتمام مدراس میں دیئے گئے تھے اور قاعدہ سے یونیورسٹی ہی کی ملک ہیں، اور ان مرحوم ومغفور کی اچانک وفات سے جہاں اور بہت سے شخصی وملی نقصانات ہوئے وہیں اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ان لکچروں کی طبع واشاعت کھٹائی میں پڑگئی۔ اور مسودہ برسوں سے انجمن مذکور کے کارکنوں کے پاس پڑا ہوا ہے، قصہ بہت طویل ہے، خلاصہ یہ کہ اب الحاج مولانا عبدالوہاب بخاری پرنسپل نیو کالج مدراس کے حُسن توجہ سے شاید کوئی صورت جلد طبع واشاعت کی نکل آئے۔

جی ہاں اور غلطیوں اور باریک کتابت کے باوجود الحمدللہ کسی طرح چھپ گئی۔ اس حقیر کوشش کو بہترین تفسیر ٹھہرانا تو محض افراطِ حسن ظن کا تقاضا ہے، باقی چار صاحبوں کے جو نام لئے گئے ہیں ان کے علم وفضل سے بھلا اس بے علم وبے بضاعت کو کیا مناسبت ہے، اس کے مسودۂ اول کو کہنا چاہئے کہ ۱۸-۲۰ سال ہو چکے اب نئے اڈیشن کے لئے جو نظر ثانی کرنی پڑ رہی ہے تو کوتاہیاں اور خامیاں کثرت سے نظر کے سامنے آتی جاتی ہیں، بس اللہ ہی کی صفت ستاری پردہ ڈالے ہوئے ہے۔

ان چاروں بزرگوں کی بھی سطح ایک اور یکساں نہیں ہے، مولانا حمید الدین فراہی کا رنگ تفرد جمہور مفسرین کی راہ سے بالکل الگ ہے، ان کی تفسیر صرف منتہی طلبہ (جنھیں انگریزی میں پوسٹ گریجویٹ کہتے ہیں) کے مطالعہ کے لائق ہے، وہ بھی کسی مستند فاضل کی رہنمائی میں عام ناظرین کے لئے اس کا مطالعہ محض ایک دماغی انتشار کا باعث ہوکر رہے گا۔ مولانا ابوالکلام کی ''ترجمان'' صرف جدید مذاق والوں کے لئے ہے اور غیر مسلموں کو بھی اسلام کے قریب لانے والی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کو فہم قرآنی کا خداداد ملکہ تھا اور یہ ملت کی بدقسمتی ہے کہ مستقل تفسیر کے لئے وہ وقت نہ نکال سکے، وہ کہیں تیار ہو جاتی تو یقین ہے کہ ہر طبقہ کے کام آتی۔ حضرت تھانویؒ کی تفسیر عقائد و احکام دونوں کے باب میں ٹھیک اہل سنت کی ترجمان ہے۔ پانچواں نام مولانا مودودی کا بھی اسی صف میں رکھنے کے قابل ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم کیا علمی اور کیا عملی ہر اعتبار سے ان گنے چنے ندویوں میں تھے جن پر خود دارالعلوم ندوہ کو فخر ہے، ''صدق'' کا نقش اول جب شروع ۲۵ھ میں نکلا ہے تو یہ بھی ایک رکن ادارت تھے، ملت کی بدنصیبی کہ عین جوانی میں ۲۶ھ میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (ماجد)

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی ندوہ کے لعل شب چراغ تھے جن کی جواں مرگی پر مولانا سید سلیمان ندوی نے ''معارف'' میں بڑا دلدوز ماتم لکھا تھا، یہ بہت کم عمری میں ندوہ سے فارغ ہو گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے زبان و قلم دونوں کا جوہر ان کو عطا فرمایا تھا تقریر کرتے تھے تو مولانا ابوالکلام کی خطابت کا لطف آجاتا تھا، ویسی ہی پرجوش، ولولہ انگیز اور وجد آفریں۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو خطابت میں وقت کے دوسرے مولانا ابوالکلام ہوتے، سن ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریک آزادی

کے زمانہ میں ان کی تقریروں نے ضلع اعظم گڑھ میں ایک ہلچل پیدا کردی تھی اور ہر آن یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں دوسرے سرکردہ رہنمایانِ تحریک آزادی کی طرح یہ بھی گرفتار کرکے داخل زنداں نہ کردیئے جائیں، لیکن بحمداللہ اس کی نوبت نہ آئی اور وہ بچتے چلے گئے تا آنکہ یہ تحریک رفتہ رفتہ کمزور ہوگئی۔ ۱۹برس کی عمر میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں قرآن اور عربی ادب کے استاد ہوگئے تھے، اسی درسِ قرآن کے سلسلہ میں انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کا قرآن کی آیات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے جواز پیدا کیا تھا۔ فرماتے تھے جس طرح آلِ فرعون کے مظالم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو نجات دلائی تھی اسی طرح گاندھی جی اور ان کے مسلمان رفقاء مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، خان عبدالغفار خاں، وغیرہ انگریزوں کے مظالم سے ہندوستانیوں کو نجات دلائیں گے۔ انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ ۱۹۴۰ء کے بعد کانگریس کی تحریک آزادی جو شروع ہوگی، انشاء اللہ اس کے نتیجہ میں ہندوستان سے انگریزوں کی حکومت ختم ہوجائے گی اور ہندوستان ہمیشہ کے لئے آزاد ہوجائے گا، اس کم سنی میں اپنی بصیرت اور قرآنی علم سے انھوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی، اور ۴۲ء کی ہنگامہ خیز تحریک کوئیٹ انڈیا (Quit India) کے نتیجہ میں ہندوستان آزاد ہوگیا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں سے نجات مل گئی۔

یوں تو وہ سارے فنون ہی کی کتابوں کو بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھاتے تھے لیکن ان کا قرآن کا درس بڑا دلچسپ ہوتا تھا، قرآن کی روشنی میں وہ پولٹکل نکات بتاتے تھے کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔

انھوں نے قرآن کا متعدد حیثیتوں سے مطالعہ کیا تھا، اس وقت ان پر قومی وملی تحریکات کی وجہ سے سیاست غالب تھی، اس لئے وہ بیشتر قرآن کا درس اسی نقطۂ نظر سے دیتے تھے اور ہم طالبعلموں کو سیاست کے خوب خوب رموز وغوامض بتاتے تھے جسے سن کر ہمیں بڑا مزہ ملتا تھا۔

وہ قرآن وعربی ادب کے ساتھ حدیث کا درس بھی خوب دھڑلے سے دیتے تھے۔ ہمارے درجہ کو مسلم شریف وہی پڑھاتے تھے، کبھی کبھی میرے والد کو بھی ان کے حلقۂ درس میں

شریک ہونے کا اتفاق ہوتا تھا تو ان کو بہت تعجب ہوتا تھا کہ یہ سن اور عربی کی یہ کتب جن کے پڑھانے میں بڑے علماء اور اساتذہ کو بھی جھجک ہوتی ہے اور یہ ان کو بایں کم عمری بلا جھجک پڑھاتے ہیں۔

مولانا نگرامی کو قدیم عربی ادب خصوصاً جاہلی شعرا کے کلام پر عبور کے ساتھ مصر و شام وحجاز کی موجودہ نئی عربی اور اس کے ادب پر بھی بڑی وسیع نظر تھی، وہ نئی عربی زبان کے بڑے حامی تھے اور اس کا ایک لغت بھی تیار کر لیا تھا، وہ ان علماء کو جاہل سمجھتے تھے جو جدید عربی اور اس کے ادب سے واقف نہیں ہوتے تھے، وہ طلبہ میں جدید عربی بولنے اور لکھنے کا ذوق پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کرتے تھے، اور ان کے فیض درس سے اس زمانہ میں طلبہ خوب فراٹے سے عربی بولتے بھی تھے اور لکھتے بھی تھے۔

وہ درس نظامی کے سخت مخالف تھے، اس لئے وہ دیوبند کے نصاب اور طریقۂ تعلیم کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ ندوہ سے فراغت کے بعد مولانا شاہ انور صاحب محدث کشمیری کے دورۂ حدیث کے حلقہ میں شرکت کے لئے دیوبند بھی تشریف لے گئے تھے لیکن موصوف کا طریقہ درس واملا ان کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا اور وہاں سے واپس چلے آئے۔ وہ درسِ نظامی کے پڑھے ہوئے علماء اور اساتذہ کا مضحکہ اڑانے میں ان کو ذرا بھی باک نہیں ہوتا تھا اور فرماتے تھے کہ یہ بیچارے درس نظامی کی کتابوں کے علاوہ کچھ نہیں جانتے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے تعلق کے زمانہ میں درس نظامی کے پڑھے ہوئے اساتذہ سے اکثر لطف لیتے تھے اور ان کو چھیڑنے میں ان کو بڑا مزہ ملتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ سنئے:

اساتذہ میں درس نظامی کے بھی فضلاء تھے، انہی میں ایک مولانا عبدالاحد صاحب بھی تھے جو مدرسہ کے بانیوں میں بھی شمار کیے جاتے تھے، جن لوگوں کے مبارک ہاتھوں سے اس وادی غیر ذی ذرع میں اس مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھے، اور اس حیثیت سے مدرسہ کے حلقہ میں بڑی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ہر شخص ان کا بڑا احترام کرتا تھا، وہ اپنے ذوق کے مطابق فقہ کی امہات کتب ہدایہ وغیرہ پڑھاتے تھے، ایک مرتبہ وہ صبح کی گشت

میں مولانا نگرامی کے کمرے میں پہنچ گئے، انھوں نے ان کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا اور بڑے اعزاز واکرام واجلال کے ساتھ اپنے کمرہ میں بٹھایا، اتفاق سے گفتگو کا رُخ مدرسہ کے اس وقت کے نصاب کی طرف ہوگیا جس میں مولانا حمید الدین کے اثر سے بڑی تبدیلیاں ہوگئی تھیں، جن کو دیوبندی حلقہ چنداں پسند نہیں کرتا تھا، مگر اساتذہ میں اکثریت ان کی تھی جو اصلاح کی حامی تھی اور بتدریج درسِ نظامی کی ایک ایک کتاب نکلتی جاتی تھی، یہاں تک کہ صرف ونحو میں میزان ومنشعب، علم الصیغہ کے بجائے مولانا حمید الدین کی صرفی ونحوی ریڈریں پڑھائی جانے لگیں جن کے لئے مدرسہ ہی کے بعض منتہی طلبہ کو خاص طور سے ٹرینڈ کیا گیا تھا وہ اس وقت تک چھپی نہیں تھیں، اس لئے ہم سب ان کو نقل کر کے پڑھتے تھے، فقہ میں علامہ ابن رشد مالکی کی بدایۃ المجتہد رکھ دی گئی تھی جو اس وقت تک عام طور سے ملتی نہیں تھی، پورے مدرسہ میں اس کا ایک ہی نسخہ تھا جو مولانا حمید الدین حیدرآباد سے مستعار لائے تھے، اس کو بھی طلبہ نقل کر کے پڑھتے تھے، مولانا نگرامی نے مولانا عبدالاحد کو محض چھیڑنے کے لئے علامہ ابن رشد، حافظ ابن تیمیہ، امام ابن حزم، علامہ ابن قیم کی ایک ایک کتاب کا نام لینا شروع کیا، وہ بے چارے کہتے جاتے تھے کہ میں ان سے واقف نہیں۔ مولانا نگرامی نے کہا کہ جب آپ حضرات ان ائمہ کی تصنیفات سے واقف نہیں تو قدیم نصاب میں اصلاح کی صحیح قدر وقیمت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں، وہ بے چارے خفیف ہو کر ان کے کمرے سے اٹھ گئے، اور پھر اس مدرسہ کی خدمت سے ہمیشہ کے لئے الگ بھی ہوگئے۔ مگر تھے وہ قدیم درسِ نظامی کے بہت اچھے اور ماہر مدرس اور طلبہ ان سے بہت مطمئن تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور لطیفہ سنئے:

ایک زمانے میں درسِ نظامی کے مشہور استاد مولانا عبدالغفور جیراج پوری کا تقرر مدرسۃ الاصلاح میں ہوگیا تھا، وہ بھی مولانا فراہی کے اصلاح کردہ نصاب کو جن میں آئے دن ترمیم وتنسیخ ہوا کرتی تھی چنداں پسند نہیں کرتے تھے اور خارج وقت میں بعض طلبہ کو درسِ نظامی کی کتابیں پڑھاتے تھے، ان میں ایک میں بھی تھا جو ان سے کافیہ پڑھتا تھا۔ اسی کی شرح ''شرح جامی'' ہے جو درسِ نظامی میں نحو کی آخری کتاب ہے، اسی پر نحو کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بجائے علامہ

زمخشری کی ''مفصل'' وہاں کے نصاب میں تھی جس کو میں نے بھی پڑھا ہے۔ میں مولانا عبدالغفور صاحب سے شافیہ بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے ہزار تلاش وجستجو کے بعد بھی کہیں دستیاب نہیں ہوئی۔ فقہ میں کل دو کتابیں ایک ''قدوری'' اور دوسری ''بدایۃ المجتہد'' اور انھیں دونوں پر وہاں فقہ کی تعلیم ختم ہوجاتی تھی۔ مولانا عبدالغفور ان تبدیلیوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس نصاب سے طلبہ میں کسی فن کی بھی صحیح استعداد پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح فارسی کے پرانے نصاب میں بھی کافی ترمیم ہوگئی ہے۔ وہاں فارسی کے صرف ایک ہی استاد تھے مولانا مصطفیٰ صاحب جو مدرسہ چشمۂ رحمت غازیپور سے فارسی میں فارغ اور شمشاد لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ان کو فارسی کے اٹھارہ ہزار اشعار یاد تھے اور بیت بازی میں ایک ہی قافیہ سے پوری مقابل ٹیم کا قافیہ تنگ کردیتے تھے۔

مولانا شبلی مہتمم مدرسہ اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی، مولانا فراہی کے مکتب فکر کے بڑے پرجوش نقیب تھے اور قدیم نصاب میں ہر اصلاح وترمیم پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ایک مجلس میں جن میں مولانا ''عبدالغفور جیراج پوری'' بھی شریک تھے مولانا نگرامی نے فارسی کے نصاب میں ''گلستاں'' کے بجائے مولانا شبلی کے فارسی کلام کے مجموعے ''بوئے گل''، ''دستۂ گل''، ''برگ گل'' اور مولانا فراہی کا فارسی دیوان رکھنے کی بے ضابطہ تجویز رکھی۔ اس تجویز کا سامنے آنا تھا کہ مولانا عبدالغفور کو تاب نہیں رہی اور مجلس سے اُٹھ جانا چاہا، ان کی آتش غضب اس وقت تک سرد نہیں ہوئی جب تک کہ لائق محرک نے اپنی تجویز واپس نہیں لے لی۔ ان دونوں کی فارسی دانی، اور فارسی ذوق سے انکار کرنا مشکل ہے۔ خصوصاً مولانا شبلی کی فارسی غزلوں کو مولانا حالؔی، حافظ کی غزلوں تک ترجیح دیتے تھے لیکن ''گلستاں'' و ''بوستاں'' جیسی فارسی کی مشہور کلاسیکی کتابوں کے مقابلہ میں ہندی نژاد شعراء کے کلام کو لانا واقعی بڑی جسارت تھی، ان دونوں کتابوں میں دونوں پہلو غالب ہیں، وہ ادبی بھی ہیں اور اخلاقی بھی اور انھیں دونوں پہلوؤں کی وجہ سے نامعلوم مدت سے وہ تمام مدارس میں متداول ہیں اور آج تک کسی کو ان کو بدلنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی ایک فقہ کے پابند نہیں تھے۔

ان کا بھی فقہ میں وہی مسلک تھا جو مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ اور غیر مقلدین یا اہل حدیث سے بالکل تعصب نہیں رکھتے تھے۔ قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں وہ امام مالک کے مسلک کو پسند کرتے تھے، یعنی خفی وسری نمازوں میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا مقتدیوں کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

جن طلبہ کو ان کی تعلیم وتربیت وصحبت ومجالست کا مخصوص شرف حاصل تھا، ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ انھوں نے حماسہ کے درس میں آنے سے بہت پہلے اس کے چوٹی کے پچاس شعر زبانی مجھے یاد کرادیے تھے، اسی طرح میرے مسلک کی رعایت سے بخاری شریف کی منتخب اخلاقی حدیثیں بھی یاد کرادی تھیں۔ بعد میں اسی قسم کی حدیثوں کا ایک مجموعہ بھی ''لآلی الحکم'' کے نام سے مرتب کردیا تھا جو بہت دنوں تک وہاں کے نصاب میں شامل تھا۔ وہ میری صلاحیتوں کے اجاگر کرنے میں خاص طور سے کوشش کرتے تھے، اس زمانہ میں انھیں کی ترغیب وتشویق سے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' بہت پڑھا کرتا تھا جب میں کوئی تحریر لکھتا تو غیر ارادی طور پر اس میں الہلال کا رنگ آجاتا، اس سے وہ سمجھتے کہ یہ مشق قائم رہی تو میں الہلال کے رنگ کی اردو لکھنے پر قادر ہو جاؤں گا اور ابوالکلام ہی کی طرح اردو کا انشاء پرداز ہو جاؤں گا۔ افسوس کہ میرے والد کی وفات کی وجہ سے میری عربی تعلیم کا سلسلہ جس کو میرے والد نے بڑے ولولہ اور جوش کے ساتھ شروع کرایا تھا قائم نہ رہ سکا، اور میری تعلیم نامکمل رہ گئی اور میں اپنے شفیق استاد کے حسن ظن کے مطابق اردو کا انشاء پرداز ہونا تو الگ رہا، کسی لائق بھی نہ ہوسکا۔ یہ میری زندگی کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے، جس پر میں ہر وقت آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ بعض بعض وقت تو مجھ پر ایسا انقباض طاری ہو جاتا ہے کہ ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتا۔ مضمون تو درکنار کسی کو خط لکھنے یا کسی کے خط کا جواب تک دینے سے عاجز اور درماندہ ہو جاتا ہوں تا آنکہ لوگوں سے سلسلہ مراسلت ختم ہو جاتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے متعلق ایک بات لکھنے سے رہ گئی جس زمانہ میں مولانا شبلیؒ ندوہ کے معتمد تعلیم تھے، آریوں کے تبلیغی مرکز گروکل کانگڑی سے بہت متاثر تھے، جس کے تربیت یافتہ مبلغ اور اُپدیشک بڑے ایثار والے اور قناعت پسند ہوتے تھے اور بڑی سادہ زندگی بسر کرتے

تھے اور پورے ملک میں گھوم گھوم کر آریہ مذہب کی نہایت اخلاص کے ساتھ تبلیغ کرتے تھے۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان ان کے شکار بھی ہوگئے تھے۔ اس لئے ان کا حوصلہ بڑھتا جاتا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبلی نے ندوہ میں ''خدام الدین'' کے نام سے ایک جماعت تشکیل کی تھی، جس کا مقصد غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ واشاعت تھا۔ اس کے اصول وضوابط یہ تھے۔ سادہ کھانا، سادہ پہننا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکام اسلام کی پوری پابندی کرنا، تقویٰ اور قناعت اختیار کرنا وغیرہ۔ اس میں داخل کرنے کے لئے ندوہ کے جن سات طلبہ پر مولانا شبلی کی نگاہ انتخاب پڑی تھی، ان میں ایک مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی تھے۔ انھوں نے بچپن میں مولانا کے ہاتھ پر جن باتوں کی پابندی کے لئے عہد کیا تھا ان پر وہ زندگی بھر قائم رہے۔ وہ سادہ کھانا کھاتے تھے، موٹا جھوٹا پہنتے تھے، سادہ زندگی بسر کرتے تھے، احکام اسلام پر سختی کے ساتھ عمل کرتے تھے، ورع وتقویٰ کی مجسم تصویر تھے، حد درجہ قناعت پسند تھے، لیکن ان کو غیر مسلموں میں جاکر تبلیغ اسلام کا موقع نہیں مل سکا، دوسرے جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو قومی وسیاسی وملی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ان کی ساری توجہ انہی تحریکوں کی طرف مبذول ہوگئی، اور ان میں بقدر استطاعت دل کھول کر حصہ لیا، اعظم گڑھ میں ان تحریکوں کے فروغ میں ان کی پر جوش اور ولولہ انگیز تقریروں کا بھی دخل ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ خلافت کے ہر جلسہ میں وہ خاص طور سے مدعو کئے جاتے تھے اور اس میں بڑی پر جوش اور اشتعال انگیز تقریر کرتے تھے اور مجمع کی تحسین وآفریں سے ساری فضا گونج جاتی تھی، تاہم وہ اپنے وطن نگرام کی مقامی انجمن ''تبلیغ الاسلام'' کے صدر تھے جس کو ان کے چچا مولوی فیض الرحمٰن صاحب نگرامی نے قائم کیا تھا، یہ بہرائچ میں درس وتدریس اور قرآن پاک کے ہندی ترجمہ کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ واشاعت کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن بھی اس انجمن کی قلمی خدمت کرتے تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ آریہ سوامی دیانند جی سرسوتی کی مشہور روزگار کتاب ''सत्यार्थ प्रकाशन'' کا عربی میں ترجمہ کراکے عرب ممالک اور خصوصاً عراق میں شائع کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری مشہور اہل حدیث عالم کی کتاب ''حق پرکاش'' کا جو ''सत्यार्थ प्रकाशन'' کے رد میں ہے، اس کے زوائد سے صرف نظر کرکے ''نورالحق'' کے نام سے ترجمہ کیا جو

چھپ گیا ہے، اب یہ پتہ نہیں کہ اربوں کی یہ اسکیم کہاں تک کامیاب ہوئی اور مولانا ثناء اللہ کی کتاب کا یہ عربی ترجمہ بطور تریاق کے عرب ممالک میں پہنچایا نہیں۔

۱۹۱۵ء میں ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال کی طرف سے عورتوں کے حقوق وفرائض پر ایک مقالہ لکھنے کا اعلان ہوا تو مرحوم نے بھی اس پر طبع آزمائی کی اور ۷۵ صفحہ کا ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پیش کر دیا جس میں آیات واحادیث وآثار کی روشنی میں عورتوں کے حقوق وفرائض، فضائل ومناقب محاسن ومزایا پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ایک باب عورتوں کے اولیات پر ہے۔ یعنی جن کو عورتوں نے مردوں سے پہلے انجام دیا ہے، یہ مقالہ دو قسطوں میں ''معارف'' میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ الگ رسالہ کی صورت میں چھپنے کی غالباً نوبت نہیں آئی۔ یہ ان کے قلم کی بہت اچھی یادگار ہے۔

مدیر ''صدق'' کو ایک خط
صوفی نذیر احمد کاشمیری کا اسلوبِ تحریر

صوفی نذیر احمد کاشمیری کے متعلق ''صدق'' کی پالیسی سمجھ میں نہیں آئی، ایک طرف تو وہ ان کی ژولیدہ بیانی کا بھی معترف ہے اور جو لوگ ان کے مضامین اور افاداتِ قلم کو پسند نہیں کرتے ان کا بھی سو فیصدی ہم آہنگ ہے لیکن دوسری طرف پورے اہتمام کے ساتھ ان کے مضامین بھی شائع کرتا چلا جاتا ہے، شاید ہی کوئی مہینہ ناغہ جاتا ہو جس میں ان کے دو ایک مضامین سے ''صدق'' کے قیمتی صفحات داغدار نہ ہوتے ہوں، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس ژولیدہ نگاری اور پراگندہ بیانی میں کیا معنویت ہوتی ہے کہ باوجود ان کے اسلوبِ تحریر سے متنفر ہونے کے وہ شائع کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''صدق'' اگر ان کے مضامین کو شائع نہ کرتا تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ صوفی نذیر احمد کون بزرگ ہیں، ان کو منظر عام پر لانے کا ذمہ دار ''صدق'' اور تنہا ''صدق'' ہے جن کے مضامین پڑھتے پڑھتے قارئین ''صدق'' کا خوش مذاق حلقہ تنگ آچکا ہے، کتنے ہی صبر و ضبط کے ساتھ ان کے نگارشاتِ قلم کا مطالعہ کیجئے لیکن دو چار سطر پڑھنے کے بعد دامن صبر ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور اخبار پھینک دینا پڑتا ہے۔

ایک مرتبہ انھوں نے دارالمصنفین میں بھی نزولِ اجلال فرمایا تھا، یہ تو یاد نہیں کہ کن کن رفقائے کرام کو انھوں نے شرفِ تخاطب بخشا اور وہ لوگ ان کی شخصیت سے کس حد تک متاثر ہوئے اور ان کے دل و دماغ پر انھوں نے اپنے کیا نقوش چھوڑے، لیکن سید صاحب قبلہ کو تو ضرور دیکھا کہ

وہ ان سے ملنے ضرور جاتے تھے، لیکن شذرات میں ان کا ذکر نہیں آیا، نہ ان کا کوئی مضمون ہی ''معارف'' میں شائع ہوا۔ ورنہ دارالمصنفین میں کسی شعبۂ زندگی کا کوئی بڑا آدمی آتا تو سید صاحب نے ''معارف'' میں اس کا ذکر ضرور کیا یہاں ان کو خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں ہوئی، لیکن ان کی شخصیت ان کے علم ودانش اور ان کے فکر وخیال سے کوئی متاثر نہیں ہوا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے زمانہ ادارت میں بھی ان کے انشائے بے بدل سے ''معارف'' کے اوراق گرانبار نہیں ہوئے، بظاہر ان میں بڑی کشش ہے۔ لمبا گیروے رنگ کا کرتہ، سیاہ داڑھی، سیاہ لمبے لمبے گیسو، خوبصورت چہرہ، متوازن جسم، متوسط قامت، بہت ہی حسین وجمیل ناممکن ہے کہ کسی کی نظر ان پر پڑ جائے اور وہ ان سے متاثر نہ ہو۔

''صدق'' کی ارادت ان سے کب سے ہے، ان کے مضامین کی اشاعت سے اس کو کیا حلاوت ملتی ہے اور پھر ان سے دین ومذہب اور اردو لٹریچر کی کیا خدمت بن آتی ہے، اس کا آج تک اندازہ نہ ہوسکا، ان کا مشغلۂ زندگی کیا ہے؟ ان کا مقصد حیات کیا ہے؟ اس ذہنی عیاشی کے لئے ان کو روپیہ کہاں سے ملتا ہے؟ کس مدرسہ کے فارغ التحصیل ہیں؟ ان کا مسلک کیا ہے؟ مقلد ہیں یا غیر مقلد؟ سلفی ہیں یا حنفی؟ ان سب چیزوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اب انھوں نے مضامین لکھتے لکھتے کتابیں بھی لکھنی شروع کردی ہیں، جن کا موضوع وہی سمجھ بھی سکتے ہیں، غریب تبصرہ نگاران کے مجموعہ فکر وخیال پر اظہار رائے یا تبصرہ کے لئے قلم اٹھاتا ہوگا تو وہ کتنی مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہوگا، پھر وہ اتنا جو کچھ لکھتے ہیں اس کی طرف کسی نے اعتنا کیا ہے کہ نہیں جو مولانا مودودی نے اپنا ایک حلقہ پیدا کرلیا ہے جو ان کی کتابوں کا پڑھنا اپنا دین وایمان سمجھتا ہے، ان کا بھی کوئی حلقہ اس وقت پیدا ہوسکا ہے یا نہیں، ان کی تائید میں کسی نے بھی اپنی زبان وقلم کو جنبش دی ہے یا نہیں۔ ''صدق'' میں تو ہماری نظر سے آج تک ان کی تائید میں کوئی مضمون نظر نہیں آیا، ہمارے نزدیک تو وہ ہر حیثیت سے منفرد ہیں ان کے تفردات کا۔ ان کے اجتہادات ومعتقدات کا ان کے افکار وخیالات کا ساتھ دینے والا موجودہ نسل میں تو کوئی نہیں ہے، ان کی ہر آواز جو ''صدق'' کے محراب ومنبر سے بلند ہوتی ہے، فضا میں تحلیل ہوجاتی ہے۔

صوفی نذیر احمد کاشمیری کے مضامین کے متعلق یاد آتا ہے آپ نے کچھ لوگوں کے تاثرات شائع کئے تھے اور خود آپ نے بھی ان کی تحریروں کے بارے میں اپنے شدید انقباض کا اظہار ایک مرتبہ ''صدق'' میں فرمایا تھا لیکن اس کے باوجود بھی ان کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے جو درحقیقت مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کا حکم رکھتا ہے، جس سے طبیعت حد درجہ منغض ہوتی ہے۔ آپ کے دلکش اسلوبِ تحریر کے شیدائیوں پر تو جو گذرتی ہوگی وہ گذرتی ہی ہوگی ہم جیسے انپڑھوں، کم سوادوں پر تو ان کی تحریریں، بہت شاق گذرتی ہیں۔ وہ کیا اسلوب تحریر، کیا طرزِ نگارش، کیا اندازِ فکر، کیا زاویہ نگاہ، کیا ساختِ مزاج، کیا افتادِ طبع ہر اعتبار سے منفرد واقع ہوئے ہیں۔ رہنے والے تو وہ درحقیقت کشمیر کے ہیں اور اپنے کو کشمیری لکھتے بھی ہیں۔ صورت و شکل سے بھی وہ سراپا کشمیری معلوم ہوتے ہیں، لیکن ہندوستان کے کسی شہر میں ان کا کہیں مستقر نہیں ہے لیکن وہ ہر جگہ سے کس شنود یا نشنود اپنا رنگ الاپتے چلے جا رہے ہیں اور ''صدق'' کے قارئین کے لئے تو ایک مصیبت ہیں۔

امید ہے کہ جناب والا میری اس گستاخی کو معاف فرمائیں گے۔

نوٹ

مولانا نے مجھ کو ''صدق'' ہی میں اس کا جواب دیا تھا لیکن وہ ''صدق'' کے کس شمارہ میں ہے اس کا تلاش کرنا مشکل ہے۔ حکیم عبدالقوی صاحب کی ادارت میں ''صدق جدید'' میں جہاں تک یاد کام کرتی ہے، صوفی صاحب کا کوئی مضمون یا مراسلہ شائع نہیں ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عقائد کے لحاظ سے اہل حدیث جماعت کے زیادہ قریب ہیں اور وہ ان کو اپنا ہی ایک فرد سمجھنے لگی ہے۔

☆☆☆

ایک خط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

عربی میں ایوارڈ حاصل کرنے پر

ابھی میں آپ کو اس اعزاز پر ہدیہ تبریک پیش کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس سے کہیں بڑھ کر آپ کو اعزاز بخشا گیا جس کے آپ میرے نزدیک اپنی طویل علمی، ادبی و قرآنی خدمات اور کارناموں کے لحاظ سے اول دن سے مستحق تھے، اس میں کیوں تاخیر ہو رہی تھی اور حکومت کے اہل نظر کی نگاہ آپ پر کیوں نہیں پڑتی تھی، اس کے سمجھنے سے میں بالکل قاصر ہوں، اس سے پہلے جن لوگوں کو یہ سند و اعزاز ملا ہے۔

ان کے مستحق ہونے میں کوئی شبہہ نہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی علم وفضل، قرآن فہمی سے متعلق انگریزی و عربی و عبرانی کے وسیع لٹریچر پر غیر معمولی عبور کے لحاظ سے آپ کا کوئی حریف نہیں۔ بہر حال اگر اب بھی کارفرمان حکومت کو جوہر شناسی کی توفیق ہوئی اور اس نے ۱۵ر اگست کی آزادی کی تقریب کے موقع پر عربی کی سند اعزاز سے نوازا تو وہ بجا طور پر قابل مبارک باد ہے، اس سے ساری دنیا میں ان کا نام روشن ہوگا۔

میں سند دینے والے بزرگ رادھا کرشن سے ان کی بنارس یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ سے واقف ہوں۔ وہ ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ فلسفہ کے بھی بہت بڑے عالم ہیں اور انگریزی کے مقرر تو بہت اچھے ہیں، بہت کم لوگ اس میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں، جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے، آپ بھی ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور ایک فلسفی کی حیثیت سے بہت زمانہ سے پورے ملک میں شہرت حاصل ہے۔ ''فلسفہ اجتماع'' و ''فلسفہ جذبات'' جیسی گرانقدر فلسفہ کی کتابوں

کے مصنف ہیں، فلسفیانہ مضامین کے متعدد مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ اس وقت جمہوریہ ہند کے صدر نشیں ہیں جو ہندوستان کا سب سے بڑا دنیاوی اعزاز ہے مگر فلسفہ کو چھوڑ کر قرآن کی خدمت جو آپ نے اپنا نصب العین بنالیا ہے وہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑی عزت ہے اور خدا آپ کو بیش از بیش قرآن کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کا نالندہ کا سفر
اور
اس سفر کے بارے میں میرا ایک خط

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی گورنری کے زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی ایک مرتبہ پٹنہ تشریف لے گئے تھے اور گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرے تھے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے نالندہ کی بھی سیر کی تھی۔ ''صدق جدید'' میں اس سفر کی روداد قلم بند فرمائی تو اس میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا تو بڑا تعجب ہوا۔ اس کے متعلق یہ چند سطریں مولانا کو لکھیں۔

نالندہ کی سیر ایک زمانہ میں سید صاحب نے بھی فرمائی تھی اور اس کی بڑی دلچسپ تفصیل انھوں نے ''معارف'' میں لکھ کر پیش کی تھی۔ خیال تھا کہ آپ اور زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کے ایک ایک جزئیہ پر روشنی ڈالیں گے، لیکن آپ وہاں سے ایسا گذر گئے گویا وہ کوئی اہم چیز تھی ہی نہیں، حالانکہ آپ جیسے اہل علم واثریات سے ذوق رکھنے والے کے لئے پورے بہار میں توجہ کی طالب یہی چیز تھی جس پر بودھ ازم کی تاریخ کی بڑی شاندار عمارتیں کھڑی کردی گئی ہیں، اس سلسلہ میں ابھی تک یہ بحث چلی جارہی ہے کہ ہندوستان بودھ ازم کا استیصال برہمنوں نے کیا یا اپنے دورِ اقبال میں مسلمانوں نے کیا۔ سید صاحب کی تحقیق ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلہ سے

بہت پہلے بودھ ازم کا یہاں سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس بحث کا تعلق اگرچہ اب کے سفرنامہ سے تو چنداں نہیں ہے لیکن آپ جیسے عالم کے سفرنامہ میں یہ چیز بھی آجاتی تو بہتر تھا۔ آپ کے ادب کے قدرداں اس کے منتظر رہے ہوں گے لیکن آپ نے ان سب کو اپنی طرف سے مایوس کر دیا۔ اب کون ہے جو سید صاحب کے بعد نالندہ کا سفر کرے گا اور اپنے سحر نگار قلم سے اس تاریخی و مقدس شہر کے سفر کی روداد لکھے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالحق کی یاد میں ایک مضمون شائع کرنے کے لئے مولانا عبدالماجد صاحب کو میرا ایک خط

یہ مضمون کیا ہے برگزیدہ قائد ملت افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کی یاد میں چند آنسو ہیں کیا ان کو ''صدق'' کے دامن میں جگہ مل سکتی ہے، میں وہی ''منشور'' دہلی اور ''تنویر'' لکھنؤ کا بدنام مضمون نگار ہوں جس کی طرف ایک مرتبہ نظر کرم فرمائی تھی، یعنی ابوعلی اس رسوائے زمانہ نام کی نسبت سے اب بھی کچھ کچھ لکھا کرتا ہوں، اِدھر میں نے مولانا ابوالکلام پر دو مضمون لکھے ہیں، ایک اپریل کے قومی آواز کے سنڈے ایڈیشن میں جس کی سرخی ''شبلی اکیڈمی اور مولانا ابوالکلام آزاد'' تھی۔ دوسرا ابھی حال میں اکتوبر میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد'' ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں مضمون قومی آواز میں نظر سے ضرور گذرے ہوں گے۔ دوسرا مضمون افسوس ہے کہ کاتب کی بے توجہی اور مصحح کی کم نظری سے بہت غلط چھپ گیا بلکہ بے ترتیب ہوگیا اور بے ربط ہو جانے کی وجہ سے بہتوں نے پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی ہوگی۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکرمت نامہ کے جواب میں میرا خط

مکرمت نامہ موصول ہوا جسے پڑھ کر میں فرط انفعال سے عرق عرق ہوگیا۔ مجھے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ ''الاعتصام'' لاہور کے اثرات اتنے دوررس ہوں گے اور دنیا میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کے سب سے بڑے منزلت شناس کے قلب کے لئے سامانِ اذیت بن جائیں گے۔ میں نے یہ شعر ؎

باری میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
ہیں مشتِ خاک پر مگر آندھی کے ساتھ ہیں

کہیں لکھا ہوا دیکھ کر نہیں زبانی سن کر یاد کرلیا تھا، لیکن مولانا فرنگی محل کا نام گاندھی جی کے ساتھ اعلانوں میں اس کثرت وتواتر کے ساتھ لیا جاتا تھا کہ لوگوں نے بدھو میاں سے انہی کو سمجھا اور وہی عام طور سے لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا۔ میں نے تحقیق کی بالکل ضرورت نہیں سمجھی اور اس پر اتنی بڑی عمارت کھڑی کردی۔ یقیناً حضرت اکبر نے بدھو میاں ہی لکھا ہوگا اور اسی میں زیادہ لطف بھی ہے۔ میں اس نادانستہ سہو کے لئے صدق دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔

☆☆☆

”سیرتِ قرآنی“ کے طبع پر عبدالماجد دریابادی صاحب کے نام

مبارک باد کا میرا ایک خط

”سیرت قرآنی“ کے طبع کی بشارت ملی۔ خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان میں اپنے موضوع کے اعتبار سے آپ کی یہ منفرد کتاب خاص آپ کے اہتمام ونگرانی میں چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ اور قرآن سے ذوق رکھنے والوں کے ہاتھوں تک پہنچ گئی۔ آپ کی اس عظیم الشان قرآنی خدمت کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

میں نے پارسال اسی زمانہ میں اس مقدس کتاب کے تعارف کے طور پر کچھ ہفوات لکھ کر اخبار ”الجمعیۃ“ دہلی میں بھیجے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے میرے ان ہفوات کو شائع نہیں کیا، میں نے یاددہانی بھی کی تو کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد امام اہلسنت مولانا عبدالشکور کا انتقال ہوا اور ان پر ادارہ الجمعیۃ کے کسی ذمہ دار کا مضمون شائع ہوا، تو اس سے مجھ کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس طرح کی قرآنی خدمت مولانا عبدالشکور نے بھی انجام دی ہے جو اپنے عقیدہ ومسلک کے اعتبار سے دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اب تک ان کی یہ کتاب ان کی اور متداول کتابوں کے ساتھ جو زیادہ تر شعبہ سنی مناظرات پر ہیں، ہماری نظر سے نہیں گذری۔

اگر واقعی اس طرح کی کوئی کتاب ان کی ہے تو بلاشبہہ اس موضوع پر لکھنے کا تقدم انہی کو حاصل ہے، مگر اس کا علم غالباً مولانا ابوالکلام کو بھی نہیں تھا جب کہ انھوں نے ”سیرۃ النبیؐ“ کی تالیف کے دوران میں مولانا شبلی سے عرض کیا تھا کہ آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص

حصہ اس عنوان سے قرار دیجئے: ''قرآن اور سیرت محمدیہ''

اور اس میں صرف آیاتِ قرآنیہ کو بہ ربط و ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلو ہو سکتے ہیں، انھوں نے اس خیال پر، بہت ہی پسندیدگی ظاہر کی مگر فرمایا کہ اتنا مواد صرف قرآن سے کہاں نکل سکتا ہے کہ سیرت کا ایک باب مرتب ہو سکے، لیکن جب میں نے بہت اصرار کیا تو کہا اچھا تم اگر یہ ٹکڑا مرتب کر دو تو سیرت کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

اس کے بعد دہلی میں ملاقات ہوئی تو فرمایا مجھ کو بھی خیال ہوتا جاتا ہے کہ یہ ممکن ہے اور بہت ہی اہم چیز ہوگی۔ چنانچہ میں نے ایک مستقل سیرت نبویہ مجرد قرآن حکیم سے ماخوذ و مستنبط شروع کر دی۔ جوں جوں قدم آگے بڑھتا گیا نئے نئے دروزے کھلتے گئے، میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ قرآن پاک میں اس قدر وافر ذخیرہ خاص شخص رسالت کے حالات و وقائع کا موجود ہوگا۔ بہر حال بحمد اللہ امید و گمان سے بھی دو چند اوسع و اکمل مرتب ہو گئی۔

انسانوں کی ترتیب دی ہوئی ساری سیرتیں اور تاریخیں ایک طرف اور خود نسانِ الٰہی کا ایک کلمہ منطوقہ و محفوظ ایک طرف۔ تعجب ہے کہ اصحاب سیر نے باوجود کمال وسعی اور مشغولیت مجمع طرق و ترتیبات سیرت اس طرف توجہ نہ کی۔

بہر حال اصحاب سیر میں سے مولانا عبدالشکور لکھنوی نے مولانا ابوالکلام سے بھی بہت پہلے اس اہم کام کو انجام دے دیا تھا، مگر دنیا کو نہ مولانا عبدالشکور کی سیرت قرآنیہ کا پتہ ہے نہ مولانا ابوالکلام کی سیرت قرآنیہ کا جس کو انھوں نے مولانا شبلی کے تذبذب کے بعد مرتب کر دیا تھا۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط

یہ تو میں تحقیق نہ کرسکا کہ عادی صاحب کا بحیثیت سب ایڈیٹر کے الندوہ کے ٹائٹل پیج پر نام آیا ہے یا نہیں لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا نام تو بحیثیت سب ایڈیٹر کے ایک پرچہ پر ضرور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا ابوالکلام نے اپنے پورے دور سب ایڈیٹری میں کوئی اوریجنل (Orignal) مضمون نہیں لکھا ہے جس سے اس وقت ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا۔ ان کے جو دو تین مضمون ''الندوہ'' میں شائع ہوئے وہ سب یا تو کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہیں یا عربی اخبارات ورسائل کی تلخیص۔ ہاں ایک مرتبہ انھوں نے ندوہ کے ایک اجلاس کی جو غالباً دہلی میں منعقد ہوا تھا، روداد ضرور لکھی تھی، لیکن اس کو کسی طرح مضمون نہیں کہہ سکتے۔

مولانا آسی کے تذکرہ میں مولانا عادی کا ذکر ضمناً آیا تھا، اُن پر مستقلاً کبھی کچھ لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ ''وکیل'' امرتسر سے ان کے تعلق کا ذکر ضرور آئے گا۔

سب اڈیٹروں کے نام کا عدم اظہار خواہ صحافتی دستور رہا ہو جس پر ''الہلال'' عامل تھا، مگر مولانا شبلی کو گوارا نہیں تھا، ان کا اصرار تھا کہ ان کے بھیجے ہوئے جو لوگ ''الہلال'' میں کام کررہے ہیں، ان کے مضامین کے ساتھ ان کا نام ضرور رہے۔ ورنہ ندوہ کی تعلیم وتربیت کا اندازہ لوگوں کو کیسے ہوگا۔

جی ہاں آپ نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا کہ ''الندوہ'' مختلف پریسوں میں چھپتا رہا ہے، انہی میں ایک آگرہ کا مشہور ''مفید عام'' پریس بھی ہے جس کی طباعت وکتابت وکاغذ کا معیار بہت بلند ہے، پھر آسی پریس میں انہی عبدالعلی اور ان کے صاحبزادے عبدالوالی صاحب کے اہتمام میں

چھپتا رہا۔ درمیان میں نامی پریس لکھنؤ اور ''اصح المطابع'' لکھنؤ میں (جس کے مہتمم محمد قادر بخش صاحب تھے) چھپا۔ مگر مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیاتِ شبلی'' میں اصح المطابع کا انتساب جو مولانا آسی سے کیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ اس کے متعلق میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے اسی پریس کا نام کبھی اصح المطابع رہا ہو۔ ''الندوہ'' کے کچھ پرچے علی گڑھ کے مطبع فیض عام میں بھی چھپے ہیں۔ مولانا اکرام اللہ ندوی کے زمانہ ادارت میں تو الندوہ مستقلاً شاہی پریس لکھنؤ میں چھپتا تھا۔

میرے ہفوات میں کچھ نہ کچھ فروگذاشتیں ضرور ہو جاتی ہیں، ان کی طرف توجہ فرمائی کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ یقیناً آسی غازیپوری جن کی شہرت یوپی کے مشرقی اضلاع تک محدود ہے، ان کے بعض نعتیہ شعر خوب ہیں۔ خصوصاً ان کا یہ شعر ؎

صبا تو جا کے یہ کہنا میرے سلام کے بعد
تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

یہ شعر وظیفہ شام و سحر بنا لینے کے لائق ہے۔ ان کا یہ شعر زبان پر آتے ہی ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط

اپنے کچھ ہفوات ارسالِ خدمت کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، اگر ''صدق'' کے گرانقدر صفحات کے لائق ہوں تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔

اب تو لوگوں نے جوش عقیدت میں یا سید دشمنی یا ماجد بیزاری میں پیغمبر کے رتبہ تک مولانا کو پہنچا دیا ہے، مولانا کس قابلیت کے آدمی تھے، وہ زندگی میں بھی ایک معمہ تھے اور موت کے بعد بھی ایک معمہ بن کر رہ گئے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق ان پر بہت سے مضامین لکھے ہیں تاثراتی بھی اور ناقدانہ بھی۔ شاید ایک آدھ نظر ثانی سے گذرے بھی ہوں۔ یہ بات تو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھی کہ لوگ ان پر مضمون لکھتے لکھتے ان کا مقابلہ آپ سے یا مولانا سید سلیمان

ندوی سے کرنے لگیں گے، اوران کواردو کا سب سے بڑا مصنف بنادیں گے۔ خداایسے لوگوں پر رحم کرے اور عقل سلیم کی توفیق عطا فرمائے۔

۷ارجون کے "مدینہ" میں اسی ادارہ کے ایک صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ان کی ذاتِ خاص کے ساتھ جوشِ عقیدت یا غایت محبت کی بنا پران کی مدح وستائش میں بہت ہی غلو سے کام لیا ہے جس کا شاہ معین الدین صاحب نے بڑا سخت نوٹس لیا ہے۔اس کے متعلق آپ کے تاثرات کا شاہ صاحب کو بڑاانتظار ہے۔کیا میرے ذریعہ یہ تاثرات ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ صاحب مضمون کو(دبستان شبلی کے مشہور نظم گو شاعر جناب یحییٰ اعظمی جو مولانا ابوالکلام صاحب کی سفارش سے حکومت کے وظیفہ یاب تھے۔اس وظیفہ کی وجہ سے یاواقعی مولانا کے کمالات کی بنا پران کو مولانا سے عشق ہوگیا تھا۔انہی کا یہ مضمون تھا)اب خوداپنے اس مضمون پر ندامت ہے۔

☆☆☆

سید سلیمان ندوی صاحب کے صاحبزادہ ابوسہیل کے بارے میں

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کے نام میراایک خط

سید صاحب علیہ الرحمہ نے اخیر عمر میں محنت ومشقت اور پڑھنے لکھنے کا کام بہت کم کردیا تھا۔آپ نے اب تک جتنا بھی علمی وادبی کام کیا ہے وہ آپ کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دینے کے لئے بہت کافی ہے۔ خصوصاً قرآن کی آپ نے جو خدمت کی ہے وہ تو آپ کو شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا محمود الحسن وغیرہ مترجمین ومفسرین قرآن کی طرح ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

سید صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادہ ابوسہیل بنگلہ دیش میں اپنا سب کچھ لٹ لٹا کر معلوم نہیں کن کن مصیبتوں اورصعوبتوں اور پریشانیوں سے اپنے تمام کنبہ کے ساتھ اپنے وطن دیسنہ پہنچے اوراپنے ہی مکان میں جس کو سید صاحب نے ازراہِ دوراندیشی اپنی صاحبزادی شکیلہ کے نام جو

سید حسین ڈپٹی کلکٹر سے منسوب ہیں منتقل کر دیا تھا پناہ ملی، لیکن یہاں آ کر اپنی اور پورے کنبہ کے گذر بسر کی کیا صورت ہو اس سے پریشان ہو کر ایک روز وہ اعظم گڑھ آئے اور شام دھندلکے میں شبلی منزل پہنچے تو شاہ معین الدین صاحب کا بیان ہے کہ میں نے صورت سے نہیں آواز سے پہچانا۔ وہ سوکھ کر بالکل کانٹا ہو گئے ہیں۔ یہاں جس نے بھی ان کو دیکھا ان کی حالت زار دیکھ کر متاثر ہوا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوسرے دن اپنی بہت شکیلہ سے ملنے کے لئے فیض آباد چلے گئے، جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ مقیم ہیں۔

فیض آباد سے واپسی کے تیسرے دن صبح کو خاص طور سے مجھ سے ملنے کے لئے میرے کمرے میں آئے اور کہا کیا آپ نے مجھ کو پہچانا۔ میں ان سے کیا عرض کر سکتا تھا، ان کی روداد تو پہلے ہی مجھے معلوم ہو چکی تھی۔ ان پر رقت طاری ہو گئی اور مجھ پر بھی کوئی گفتگو نہیں ہو سکی۔ اسی وقت ان کو پٹنہ جانا تھا، میں نے رخصتی مصافحہ کیا تو بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ میرے لئے دعا کرتے رہئے گا۔

جناب عبدالمجید صاحب ڈپٹی کلکٹر کی وفات پر مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کے نام میرا خط

اخبارات میں جناب کے برادرِ مکرم عبدالمجید صاحب مرحوم ومغفور کی اچانک خبر وفات پڑھ کر سخت صدمہ ہوا، اس حادثہ کا آپ پر اس خیال سے کیا اثر پڑا ہوگا کہ والدین کے بعد بھائی بہن ہی کی ذات ایسی ہوتی ہے جو دنیا سے اٹھ جانے کے بعد پھر نہیں مل سکتی، اور پھر آپ کے تو لے دے کے یہی ایک بھائی تھے وہ آپ کے حد درجہ ناز بردار اور آپ ہی کی طرح دین دار، متورع اور پرہیزگار اور دینی و دنیوی معاملات سے شغف رکھنے والے جس کی تفصیل مرحوم کے حادثہ وفات کی خبر کے ساتھ لکھنؤ اور کانپور کے روزناموں میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اس دینی شغف

اور گونا گوں دینی وملی وقومی خدمات کے صلہ میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اوران کی مغفرت فرمائے۔

مجھے اس کا علم تو بہت زمانہ سے تھا کہ آپ کے ایک بھائی ہیں اور اللہ کے فضل سے ڈپٹی کلکٹر ہیں اور ان کے چاروں لائق وفائق صاجزادوں سے آپ کی چاروں صاجزادیاں بیاہی ہیں لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ دنیاوی جاہ ومنصب رکھنے کے ساتھ ان اوصاف حمیدہ کے بھی حامل ہیں۔

(''صدق جدید'' کے شمارہ ۱۴؍اپریل ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا)

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبؒ کے نام ایک خط

''قومی آواز'' سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ یوپی گورنمنٹ کے ایک قائم کردہ ادارہ نے جو اس سے پہلے ہندی اور بعض دوسری قومی زبانوں کے ادیبوں کو بھی انعام دے چکا ہے۔آپ کے نصف صدی سے زیادہ کی شاندار اور ناقابل فراموش ملی وقومی وسیاسی خدمات اور آپ کے قابل فخر علمی وادبی وفلسفیانہ کارناموں کے اعتراف میں جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے، پانچ ہزار کی ایک رقم خدمت والا میں پیش کی ہے، جس کے آپ آج سے بہت پہلے بجا طور پر مستحق تھے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے لئے آپ کو مبارک باددوں یا اس ادارہ کو ہدیہ تبریک پیش کروں جس نے یہ رقم دے کر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔دیکھنا ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی کو جس کی ہرزبان کے کلاسیکی ادب کے لئے بے پناہ فیاضیاں اور زرپاشیاں زبان زد خاص وعام ہیں۔ مرکزی حکومت کے شعبۂ تعلیم کو اور ان سب سے بڑھ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اس قدر دانی اور جوہر شناسی کی توفیق کب ہوتی ہے جو ابھی ابھی چند برس پہلے غیر متوقع طور پر جناب جگر مرادآبادی کو ان کی شاعری پر ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دے چکی ہے۔جگر اس کے مستحق تھے کہ نہیں لیکن یہ غلط بخشش اس وقت مجھے ذاتی طور پر بہت کھلی، گو یحییٰ اعظمی اور مولانا شاہ معین الدین کی وساطت سے ان کی خدمت میں بھی مجھے نیاز حاصل تھا وہ ان حضرات سے ملنے دارالمصنفین تشریف لاتے تھے تو ان کی بزم شعروسخن میں میں بھی شریک ہوتا تھا اور ان کو داد دیتا تھا۔ایک مرتبہ وہ شراب میں بالکل

مخمور حسب معمول دار المصنفین تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کلام پر کسی کی داد پسند نہیں فرماتے ہیں۔ ان کا کلام سننے کے لئے مجلس منعقد ہوئی تو عام لوگوں نے خاموشی سے ان کا کلام سن لیا، کسی کو داد دینے کی جرأت نہیں ہوئی کہ اگر وہ بھری محفل میں داد دینے والے سے پوچھ بیٹھیں کہ تم نے کیا سمجھا تو بڑی ذلت ہو جائے گی۔ وہ واپس جانے لگے تو میں اور جناب یحییٰ صاحب ان کے ساتھ ہو گئے۔ راستہ میں انھوں نے پھر اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ مجھ کو داد نہ دینے کا خیال ذہن سے جاتا رہا، ان کے ایک شعر پر بے ساختہ میری زبان سے ''واہ'' نکل گئی تو میں سہم گیا، لیکن انھوں نے میرے اس داد کی داد میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ کر دی کہ گل گفتی، گل گفتی، گل گفتی۔

جناب جگر صرف غزل گو شاعر تھے اور اصنافِ سخن کی طرف وہ متوجہ نہیں ہوئے۔ صرف اتنے سے کمال پر ایک عظیم الشان تعلیمی ادارہ کی طرف سے اتنی بڑی ڈگری دے دی گئی اور اس اعزاز بخشی پر ادبی حلقوں کی طرف سے جو آج کل ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے زیر اثر ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور ایک لمحہ کے لئے نہیں سوچا گیا کہ ابھی ملک میں قحط الرجال نہیں ہوا ہے، ابھی بہت سے لوگ بقید حیات ہیں جو ان موسیقاروں، شاعروں اور ادیبوں سے کہیں زیادہ اپنی طویل پُر عظمت ادبی و علمی خدمات اور کارناموں کی بنا پر ان ڈگریوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان کی ساری علمی و ادبی خدمات و مذہبی خدمات ایک طرف آپ نے فلسفہ میں جو کاوشیں کی ہیں اور تنہا اپنی ذات سے اس پر جو بیش بہا لٹریچر اکٹھا کر دیا ہے وہ ہر طرح کی مدح وستائش، تعریف وتوصیف اور انعام واکرام کا مستحق ہے۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کے نام ایک خط

خدا کا شکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست وکشاد نے اتنی مدت کے بعد اپنی قدر شناسی کا ثبوت دیا اور آئندہ کنوکیشن میں آپ کو اور پروفیسر رشید احمد کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کے آپ دونوں حضرات اپنی گوناگوں علمی وادبی خدمات کے

اعتبار سے اول روز سے مستحق تھے جو کام یونیورسٹی کے اور وائس چانسلروں خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین، بشیر حسین زیدی، افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کرنولی اور زین یار جنگ جیسے علم دوست اور علم وفن کے قدرداں بزرگوں کے زمانہ میں نہیں ہوا، وہ جناب علی محمد خسرو کے زمانۂ خسروی میں ہوگیا۔ اس قدر شناسی کے لئے ان کو جتنا سراہا جائے کم ہے، نواب زین یار جنگ کے بزرگوں سے تو آپ کے بڑے تعلقات تھے، ان کے نانا عمادالملک سید حسین بلگرامی کے ایک مجموعہ مضامین پر آپ نے اس کی اشاعت کے وقت ایک مقدمہ بھی لکھا تھا۔ بہر حال اتنی مدت کے بعد اپنی ایک آرزو وتمنا کے برآنے کی مجھ کو خوشی ہے۔ اس کا اظہار میں لفظوں میں نہیں کر سکتا۔ لیکن افسوس:

ع: عید ہوئی ولے شام کو

کاش کہ یہی کام آج سے تیس چالیس برس پہلے ہوگیا ہوتا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے بھائی ماسٹر نیاز احمد ایم، اے علیگ شبلی کالج میں مدتوں لکچرر رہے ہیں۔ بہت زمانہ تک ان کا قیام دارالمصنفین ہی میں تھا۔ اس لئے ان سے میری اچھی خاصی رسم وراہ ہے۔ شاید پروفیسر صاحب ہی کی سفارش سے ان کا تقرر اس کالج میں ہوا تھا لیکن پروفیسر صاحب کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل نہیں ہے۔ وہ ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں شبلی منزل آئے تھے۔ ''مضامین رشید'' کے دو مضمون: ایک ''ارہر کا کھیت'' دوسرا ''حاجی ختنہ'' پر اپنے وجود میں آنے کے لئے اسی شبلی منزل کے اسی چند روزہ قیام ہی کے رہین منت ہیں، لیکن افسوس ان سے ملاقات تو درکنار ان کی خاطر خواہ زیارت بھی نہ کر سکا۔ ان سے تھوڑا بہت بھی تعارف ہوتا تو اس اعزاز پر ان کی خدمت میں بھی ہدیہ تبریک پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا۔ سید صاحب کے قدرشناسوں میں یہ پروفیسر صاحب بھی تھے۔ سید صاحب علی گڑھ تشریف لے جاتے تھے تو انہی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ ''معارف'' کے سلیمان نمبر میں سید صاحب پر ان کا بھی ایک مضمون ہے۔

مجھے مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے اسی وقت سے شکوہ تھا جب انھوں نے ایک شاعر کو محض اس کے حُسن تغزل وقبول عام پر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری پیش کی تھی۔ آپ دونوں جیسے اردو کے صاحب طرز انشاء پردازوں کو اعزازی ڈگری دیئے جانے کا فیصلہ کر کے انھوں نے صحیح معنیٰ میں

اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ اس اعزاز پر میں آپ کو بصد خلوص ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ پوری ملت پر صحت وتوانائی کے ساتھ آپ کا سایہ عرصہ تک قائم رکھے اور علم وادب کی خدمات آپ کے قلم سے اسی طرح انجام پاتی رہیں۔ آپ نے اب تک ہزاروں کیا لاکھوں صفحے لکھے ہوں گے۔ اس عمر میں اب زیادہ سے زیادہ آرام فرمائیں اور کوئی فکر نہ کریں:

ع: کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک اور خط

۱۹۷۵ء میں مسلم یونیورسٹی کے کنووکیشن کے انعقاد اور آپ کو اور آپ کے واجد ادبی معاصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کو اعزازی ڈگری پیش کئے جانے کی مسرت انگیز خبر اخبارات میں نظر سے گذری تو میں نے آپ کو مبارک باد کا جو خط لکھا تھا اس کا ذکر جناب والا نے ازراہِ اخلاص لکھنؤ یا دریاباد کی کسی ملاقات میں صباح الدین صاحب سے فرمادیا تھا۔ انھوں نے سفر سے واپس آنے کے بعد ''معارف'' میں اس پر بہت ہی عقیدت مندانہ شذرات لکھے اور مجھ کو پڑھ کر سنایا اور ساتھ ہی طنز بھی کیا کہ ماجد میاں کہہ رہے تھے کہ آپ ان کو بڑا لمبا لمبا خط لکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں میں نے بھی مولانا کو مبارک باد کا خط لکھا تھا۔ مگر وہ زبان وادب پر آپ کی قدرت کے قائل اور آپ کو اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز بھی سمجھتے تھے اور آپ کی تحریروں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔

اس کنووکیشن کے انعقاد کی خبر سے جتنی خوشی ہوئی تھی اتنی ہی اس کے ملتوی ہوجانے کی خبر سے بہت دکھ بھی ہوا اور دعا کرتا رہا کہ اس کا انعقاد جلد سے جلد ہو، اور آپ دونوں حضرات کی خدمت میں اعزازی ڈگریاں جن کے آپ دونوں بزرگ اپنے طویل ادبی خدمات اور کارناموں

کی بنا پر اول روز سے مستحق تھے، جلد سے جلد پیش کردی جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ انہی علی احمد خسرو کے دور خسروی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیا اور آپ حضرات کی خدمت میں پورے احترام کے ساتھ ڈگریاں پیش کردی گئیں۔ یہ چیز آپ دونوں حضرات کے لئے اس عمر میں خوشی کا باعث کیا ہوسکتی تھی یہ تو یونیورسٹی پر آپ لوگوں کے طویل ادبی وعلمی خدمات کے اعتراف وقبول کا ایک حق تھا جس کی ادائیگی کی توفیق اس کو اب جاکر ہوئی۔ میں آپ کو اس اعزاز کے ملنے پر دل سے مبارک باد دیتا ہوں، اس خبر سے اور زیادہ خوشی ہوئی کہ اس عظیم الشان تاریخی تقریب میں پروفیسر صاحب تو اپنی بیماری کی وجہ سے علی گڑھ میں رہ کر شریک نہ ہوسکے، لیکن آپ بحمد اللہ بایں ضعف، ناتوانی اور پیری کے بنفس نفیس شریک تھے۔ کاش کہ اس منظر کو دیکھنے کے لئے آپ کا یہ قدیم نیاز مند بھی موجود ہوتا۔ ''صدق جدید'' میں آپ کے قلم سے اس تقریب کی مختصر ترین روداد اور تاثرات پڑھ کر اس موقع کے تمام مناظر میری چشم تصور کے سامنے پھر گئے۔ اس عمر میں محض دار المصنفین کی بہی خواہی میں مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں حسب معمول شرکت کے لئے لکھنؤ یا دریاباد سے چل کر اعظم گڑھ آنا اور اسی کے معاً بعد لکھنؤ سے علی گڑھ جیسے دور دراز شہر کا سفر کرنا اور کنووکیشن کی تمام تقریبات میں شرکت کرنا بہت بڑی کرامت ہے جس پر جتنی خوشی کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

اڈیٹر ''چٹان'' لاہور کے نام ایک خط

مولانا عبد الماجد دریابادی کی ادھر جو دو تین کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں پہلی کتاب ''خطبات ماجدی'' یعنی سیرت نبوی قرآنی ہے۔ یہ ان کے سیرت نبوی پر قرآن کی روشنی میں متعدد لکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مدراس کی ایک انجمن اسلامیہ کے تحت دیئے تھے۔ مدراس میں ایک انجمن ہے جو سال دو سال کے بعد اسلامیات کے کسی موضوع پر ہندوستان کے اسلامیات

کے کسی ماہر عالم اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فاضل سے لکچر دلواتی ہے۔ اب تک اس کے تحت باوقات مختلفہ جو چار آدمی اس انجمن کی دعوت پر لکچر دے چکے ہیں، ان میں آخری نام مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہے جو اب فلسفی، ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز سے کہیں زیادہ ایک عالم دینیات، مفسر و مترجم قرآن کی حیثیت سے مشہور ہیں اور ایک زمانہ سے قرآن کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ قرآن مجید پر متعدد چھوٹے بڑے رسالوں کے علاوہ انھوں نے قرآن ہی سے متعلق تین بڑے عظیم الشان کام کئے ہیں۔ ایک انگریزی تفسیر قرآن ہے۔ دوسرا اردو تفسیر قرآن ہے اور تیسرا قرآن کی روشنی میں سیرت نبوی قرآنی ہے جس کے متعلق اپنے تاثرات حوالہ قلم کرکے خدمتِ عالی میں بھیج رہا ہوں۔ مقصود "چٹان" کے وسیع ادبی حلقہ میں ان کی اس منفرد تصنیف کا تعارف ہے۔ امید ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط

میں حسب معمول دوسرے دن اپنے وقت پر دارالمصنفین پہنچا تو مجھ پر ایک نوٹس (Serve) ہوا کہ آپ کا جو مراسلہ "الاحتساب" علی گڑھ میں شائع ہوا ہے وہ خواہانہ ہے یا معاندانہ۔ اس کو علی میاں کے پاس بھیجا جا رہا ہے، وہ جو فیصلہ کریں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔

میں یہ نوٹس پڑھ کر سخت متحیر ہوا کہ تعبیر اور انداز بیان کی غلطی تو ہو سکتی ہے وہ معاندانہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر وہ خدانخواستہ مخالفانہ، مخاصمانہ، معاندانہ ہوتا تو خود مولانا محمد تقی امینی جو شاہ صاحب سے بیحد عقیدت رکھتے ہیں اس کو کیوں شائع کرتے۔

میں نے یہ نوٹس رکھ لیا اور کوئی جواب نہیں دیا، اس کے بعد کتب خانہ کے لوگوں کو یا باہر کا جو بھی صاحب ذوق، صاحب علم کتب خانہ میں آتا میں اس کو دکھلاتا وہ یہی کہتا کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا اتنا سخت نوٹس لیا جائے۔

جس طرح "مکتوبات سلیمانی" کی اشاعت کی تائید میں "صدق جدید" میں میرے

مراسلہ کے شائع ہونے پر سختیاں شروع ہوگئی تھیں، اسی طرح اس مراسلہ کے ''احتساب'' میں چھپنے پر سختیاں شروع ہوگئی ہیں اور اس کو عناد پر محمود کیا جارہا ہے جو میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا۔

آپ اپنی اور کتابوں کی طرح مکتوبات کے ان دونوں مجموعوں کی ایجنسی یہاں قائم کرنا چاہتے تھے لیکن آپ کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ حالانکہ ان دونوں مجموعوں سے شاہ صاحب نے حیات سلیمان کی تالیف وترتیب کے زمانہ میں کافی فائدہ اٹھایا ہے جن کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں۔

معلوم نہیں ''احتساب'' کا یہ مراسلہ آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ اگر گزرا ہے تو آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط
مولانا کی علالت کی خبر سن کر

''صدق'' کی گزشتہ اشاعت میں نصیب دشمناں جناب والا کی علالت کی افسوسناک خبر نظر سے گزری تھی اور خیال تھا کہ یہ بالکل عارضی ہوگی اور جناب والا خدا کے فضل وکرم سے صحت یاب ہوگئے ہوں گے، لیکن اس کا نیا پرچہ آیا تو معلوم ہوا کہ علالت کافی ممتد ہوگئی اور بخار کا سلسلہ لگاتار دو ہفتہ تک رہا جس سے بے حد کمزوری آگئی ہے اور آپ اب تک کام کرنے سے معذور ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے اور ضعف کے نتیجہ میں جو کھانسی وغیرہ پیدا ہوگئی ہے اس سے جلد سے جلد نجات دے دے اور حسب معمول پوری توانائی کے ساتھ اپنے تمام علمی مشاغل میں مصروف ہوجائیں، جن میں ''صدق جدید'' کی ادارت بھی ہے، جس کی اشاعت کا اس کے قدردانوں اور آپ کے ادب کے پرستاروں کو بڑا انتظار رہتا ہے۔

اب کی مرتبہ بدقسمتی سے تنہائی میں آپ کی زیارت وملاقات کی سعادت تو حاصل نہ ہوسکی تاہم یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ دوسال پہلے اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے موقعہ پر تشریف لائے تھے تو اس سے کہیں زیادہ بحمد اللہ توانا، تندرست اور خوش وخرم تھے اور مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ابھی آپ کو بہت دنوں تک علم وادب، دین وملت اور قوم وملک کی خدمت کے لئے زندہ صحیح وسلامت اور پیری کے تمام عوارض سے محفوظ رکھے۔

سید صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی اخیر عمر میں پڑھنے لکھنے کی محنت بہت کم کردی تھی اور ''معارف'' میں ہلکے پھلکے مضامین لکھنے لگے تھے۔آپ نے اپنے ذمہ بہت سارے مشقت طلب علمی کام لے رکھے ہیں جن میں جہاں تک مجھ کو معلوم ہے کوئی آپ کا ہاتھ بٹانے والا نہیں ہے۔حکیم عبدالقوی صاحب جو آپ کے ہم ذوق ہیں وہ مستقلاً لکھنؤ میں رہتے ہیں اس لئے جناب والا سے گزارش ہے کہ آپ اپنی صحت کا زیادہ خیال رکھیں۔خدارا اس کو مقدم رکھئے اور پڑھنے لکھنے کی محنت کم کردیجئے۔اس عمر میں آپ کو آرام کی بڑی ضرورت ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط

شفقت نامہ خود جناب والا کے قلم سے لکھا ہوا مجھے دارالمصنفین کے پتہ سے ملا۔اس لطف وکرم کے لئے جناب والا کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔اس سے مجھ کو بڑی قلبی تسکین ہوئی۔جس طرح اخیر عمر میں مولانا شاہ معین الدین نے علی میاں سے بہت تعلقات بڑھا لئے تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد صباح الدین صاحب کے بھی ان سے بڑے تعلقات ہوگئے ہیں۔ علی میاں نے میرے معاملہ میں اپنے سارے اختیارات انہی کو بخش دیئے ہیں۔کل تک علی میاں بھی مجھ پر بہت مہربان تھے، میں نے سوانح مولانا محمد علی مونگیری پر تبصرہ لکھا۔ان کی کتاب ''سوانح مولانا عبدالحی'' ان کے قلم سے ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی تو اس پر میں نے ان کو خراج تحسین

پیش کیا تو انھوں نے جواب میں لکھا کہ آپ بہت زمانہ تک سید صاحب کے ساتھ رہے ہیں، اس کا وزن محسوس کرتا ہوں۔

خدائے رؤف ورحیم عمر کی ہر منزل میں آپ کے ساتھ رأفت ورحمت کا معاملہ فرمائے کہ آپ نے یکا یک فلسفہ چھوڑ کر جس کا آپ کو فطری ذوق تھا اور جس میں آپ کی متعدد گرانقدر تصانیف ہیں اور مضامین کے متعدد مجموعے ہیں اور جس میں پورے ملک میں منفرد تھے۔ قرآن کی خدمت کو اپنی بقیہ زندگی کا نصب العین بنالیا اور اس کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ اس کے صلہ میں بڑھاپے کے مصائب و پریشانی سے مامون ومحفوظ رکھے اور قرآن کی مزید خدمت کے لئے زیادہ سے زیادہ توفیق ارزانی فرمائے۔

آپ کی بیماری سے مجھے بڑی تشویش پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ سے دست بدعا ہوں کہ آپ کو صحت وعافیت سے نوازے اور آرام بخشے۔

حکیم عبدالقوی صاحب اڈیٹر ''صدق جدید'' کے نام ایک خط

آپ کا ''صدق جدید'' میرے نام برابر آتا ہے لیکن کبھی کبھی یا تو ناغہ ہوجاتا ہے یا راستہ ہی میں باذوق حضرات کے نذر ہوجاتا ہے۔ بہر حال آپ کے اس لطف وکرم ونوازش کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں آپ نے اپنی تحریروں سے اس کے معیار میں ذرہ برابر بھی فرق آنے نہیں دیا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا باحیات ہیں اور انہی کے زیر سایہ ''صدق'' شائع ہورہا ہے۔ آپ نے ان کے منفرد اسلوب کا خوب تتبع فرمایا ہے، آپ کی تحریریں بالکل مولانا ہی کی تحریر میں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے پڑھنے میں مجھے وہی لذت ملتی ہے جو مولانا کی تحریروں کے پڑھنے میں ملتی ہے۔ ۲۰؍ مارچ ۱۹۸۱ء کے تازہ شمارہ میں دو تحریروں سے میں بہت متاثر ہوا۔ ایک تو خود مولانا ہی کے قلم سے ہے جو بیحد مؤثر ہے جس کو پڑھ کر ہمایوں کی زندگی کے لئے بابر کے ایثار جان کی یاد تازہ ہوگئی۔ بلکہ یہ واقعہ اس سے بھی کہیں زیادہ دلدوز اور مؤثر ہے جس سے میری آنکھیں نم

ہوگئیں۔ایک اجنبی بیمار بچے کی زندگی کے لئے ایک مولانا نے اپنے سات برس کے تندرست بچہ کی زندگی قربان کردی۔اور یہ قربانی بارگاہِ ایزدی میں قبول بھی ہوگئی اور خود اپنے ہاتھوں سے قبرستان جاکر اکلوتے جگر گوشہ کو پیوند خاک کرآئے اور اس واقعہ کو مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے، جس کو حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی نے ''صدق جدید'' مورخہ ۱۹۶۲ء سے نقل کرکے ''صدق جدید'' کی ۱۵ رجون ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ہم اس غیر متوقع حادثہ سے والدین پر یقیناً قیامت گذر گئی ہوگی۔

دوسری مولانا کی شاعرانہ حیثیت پر محمد اسماعیل صاحب کی پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے نشری تقریر ہے۔ مجھے مولانا کے فلسفی، ادیب، انشاپرداز، نقاد، صحافی، پھر مترجم اور مفسر قرآن ہونے کا تو علم تھا اور ان تمام حیثیات سے ان کو شہرت بھی حاصل تھی جس میں ان کو کوئی چیلنج نہیں کرسکتا تھا لیکن ان تمام حیثیات کے ساتھ وہ شاعر بھی تھے اور کبھی کبھی طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔اس کا علم تو مجھے پہلی مرتبہ اس نشری تقریر کی اشاعت سے ہوا جو ۲ رمارچ کے ''صدق جدید'' کی زینت ہے۔ان کے تخلص ''ناظر'' کا تو مجھے ''معارف'' کے ذریعہ ضرور علم تھا اور مولانا محمد علی جوہر کی ایک نعتیہ غزل کے ایک مصرعہ کی طرح میں جہاں مولانا سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں نے طبع آزمائی کی تھی، مولانا نے بھی ۷، ۸ شعر لکھے تھے اور وہ ''معارف'' میں شائع بھی ہوئے۔ پھر بھی میں ان کو اور شعرا کی طرح شاعر نہیں سمجھتا تھا کہ جیسے مولانا ابوالکلام اپنے تخلص ''آزاد'' کے ساتھ شاعر تھے، اسی طرح مولانا اپنے تخلص ''ناظر'' کے ساتھ شاعر ہوں گے۔انھوں نے شاعری کو اپنی ساری عمر ذریعہ عزت نہیں بنایا نہ کبھی اس میدان میں اترے۔نہ کسی مشاعرہ میں شریک ہوئے اور نہ کہیں اپنے کو شاعر اور سخن سنج کی حیثیت سے پیش کیا۔

ان کی اصل شہرت کا سبب ان کی نثر نگاری اور انشاپردازی ہے اور اسی میں وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے۔ بہت زمانہ تک فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔اور اس خشک موضوع کو اپنے حُسن انشا سے نہایت دلچسپ اور گوارا بنا دیتے تھے اور ان کی فلسفیانہ کتابوں اور مضامین کو لوگ بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھتے تھے بلکہ ان کے پڑھنے والوں کا ایک خاص حلقہ ہوگیا تھا۔

ان کے ڈرامہ ''زود پشیمان'' کی بڑی شہرت ہے اور وہ بھی ان کے قلم کا شاہکار ہے لیکن وہ اب تک میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ اس نشری تقریر سے یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس میں مختلف کرداروں کے تحت جو غزلیں اور اشعار آتے ہیں وہ سب ''مرزا رسوا'' کی طرح انھیں کی تصنیف کردہ ہیں جس سے شاعری میں ان کی پختگی اور کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

حکیم عبدالقوی صاحب کے نام ایک خط

محترمی!

میرے ناچیز ہفوات کی رسید جو میں نے ارسال خدمت کئے تھے حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی کے نام آپ کے والا نامہ کے ذریعہ مل گئی اور اس کے ساتھ یہ بشارت بھی کہ حسب گنجائش آئندہ کسی اشاعت میں وہ آبھی جائیں گے۔ اس لطف وکرم کے لئے کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ میں اگرچہ خامہ فرسائی برابر کرتا رہتا ہوں اور وہ کسی لائق ہوجاتا ہے تو وہ شائع بھی ہوجاتا ہے، لیکن کسی فرمائشی مضمون کی تعمیل پر آج تک قادر نہیں ہوسکا۔ جہاں کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی میرا ذہن بند ہوجاتا ہے۔ مولانا اور دارالمصنفین کے تعلقات کی تاریخ ایک اہم موضوع ہے جس کا حق کوئی صاحب کمال اہل قلم ہی ادا کرسکتا ہے۔ یہاں کے ایک کارکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں نیاز دارالمصنفین سے اپنے ابتدائے تعلق کے زمانہ ہی سے حاصل ہے اور ان کے ادب وانشا کا پرستار تو اپنی مدرسہ سرائے میر کی طالب علمی کے زمانہ سے ہوں لیکن باقاعدہ تعارف کی جو عزت حاصل ہوئی اس کی ایک تاریخ ہے۔ میں تحریک پاکستان کا حامی تھا اور اکثر مسلم لیگی اخبارات میں ابوعلی کے قلمی نام سے میرے مضامین شائع ہوتے رہے اور وہ مولانا کی نظر سے بھی برابر گزرتے رہے، ان کے اسلوب سے یہ تو ضرور سمجھتے رہے کہ ان کا لکھنے والا ندوہ یا دارالمصنفین کے حلقہ کا ہی ہوسکتا ہے لیکن متعین طور پر ان کو اس کی تحقیق نہیں ہوسکی کہ ہے آخر وہ کون؟ اسی دوران

میں مولانا شاہ معین الدین ندوی سے لکھنؤ میں ان کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے ان سے دریافت فرمایا کہ یہ ابوعلی کون ہیں جن کے مضامین روزنامہ ''منشور'' وغیرہ میں شائع ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے دارالمصنفین کی نسبت سے میرا ان سے غائبانہ تعارف کرایا تو وہ مجھ ناچیز سے ملنے کے مشتاق ہوگئے۔ اسی کے کچھ دنوں کے بعد وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے دارالمصنفین آئے تو پھاٹک پر پہنچتے ہی استقبال کرنے والوں سے پوچھا کہ آپ کے یہاں وہ ابوعلی کون ہیں جن کے پاکستان تحریک کی حمایت میں اکثر اردو روزناموں میں بڑے ولولہ انگیز مضامین نکلتے ہیں میں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب تک دارالمصنفین پہنچ نہیں گیا وہ میرے نام کی رٹ برابر لگاتے رہے۔ دوسرے دن حسب معمول وقت پر وہاں پہنچا تو مولانا مسعود علی ندوی نے مجھ کو اپنے دفتر میں بلایا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں مولانا بھی رونق افروز تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ یہ مولانا جب سے آئے ہیں تمہارے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ میں ان کو سلام اور مصافحہ کرکے ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھ کو دیکھ رہے ہیں اور میں ان کو دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات چیت نہیں کی اور میں پھر ان کو سلام کرکے اپنی جگہ پر آگیا، مگر یہی سرسری خاموش ملاقات رفتہ رفتہ عقیدت ومحبت، ارادت میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے بعد وہ جب بھی دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے تشریف لاتے تو مجھ کو بار یابی کا شرف ضرور بخشتے۔ جس کی یاد میرے لئے ہمیشہ سرمایہ سعادت رہے گی، لیکن اس تقرب واختصاص کے باوجود اپنی اس فطری کمزوری کی وجہ سے آپ کی فرمائش کی تعمیل سے بالکل معذور ہوں۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔

☆☆☆

مولانا دریابادی
اور
مولانا رضا انصاری فرنگی محلی

مؤقر روزنامہ ''قومی آواز'' کے ۳۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کے ہفتہ وار ضمیمہ کے پہلے صفحہ پر مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کے ایک طویل مقالہ ''پیر و مرید کی آویزش کی طلسم ہوش ربا'' کی دوسری قسط پر عبدالنافع قدوائی لکھنؤ یونیورسٹی کا جو سنجیدہ مراسلہ قومی آواز مورخہ ۶ رجنوری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے ہر اس شخص کو اتفاق ہوگا جو شریفی و سعودی قضیہ کی تاریخ اور اس کے تمام جزئیات سے واقف ہوگا۔ میں نے بھی مولانا دریابادی کی خدمت میں مولانا رضا انصاری رنگی محلی کے اظہار نیاز مندی و عقیدت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے۔ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے چھٹے اجلاس منعقدہ اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۶۹ء کے موقع پر یہ دونوں حضرات شبلی منزل میں سید صباح الدین صاحب کے کوارٹر کے برآمدہ میں بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے، ماجد میاں تو ایک طویل کرسی پر آرام فرما تھے اور مولانا رضا انصاری ایک مترشد اور سعادت مند شاگرد کی حیثیت سے بے دستہ کی ایک کرسی پر فروکش تھے۔ میں جب حسب معمول ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو مولانا ناشتہ کررہے تھے اور اسی دوران میں دونوں صاحبوں میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مولانا رضا انصاری جن سے میں پہلے سے روشناس تھا، اس طرح سے عقیدت کے ساتھ اپنے معروضات و خیال پیش کررہے تھے کہ اس کو دیکھ کر کوئی اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ خدانخواستہ انصاری صاحب اپنے دل میں ماجد بیزاری کا بھی جذبہ رکھتے ہیں۔ ناشتہ کرنے کی حالت ہی میں مولانا نے فرط اخلاق سے مجھ ناچیز کا انصاری صاحب سے یہ فرما کر تعارف کرایا کہ یہ فرضی ناموں سے اخبارات میں برابر لکھتے رہتے ہیں، اب کی مرتبہ مولانا کی خاطر خواہ پذیرائی

نہیں ہوئی تھی، اس کا مولانا پر بڑا اثر تھا اور جلد سے جلد دریاباد واپس جانے کی فکر میں تھے۔ مولانا نے ان سے میرے مضمون نگاری کی تعریف فرمائی تو رضا انصاری صاحب نے فرمایا کہ میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ تو برابر چھپتے رہتے ہیں۔ اس ہر مولانا نے اپنی خوش طبعی میں فرمایا کہ جی ہاں یہ کچھ مخفی ہیں اور کچھ ظاہر ہیں۔ اس سے رضا انصاری صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ رضا انصاری صاحب کچھ دیر کے بعد اٹھ گئے، لیکن میں ان کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک مولانا کی خدمت میں بیٹھا رہا۔ اس درمیان میں ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر عبدالعلیم صاحب سے جو سامنے کے کمرے میں مقیم تھے، ملنا تھا۔ پہلے مجھ کو بھیجا کہ دیکھو کہ وہ کمرے کے اندر ہیں یا باہر ہیں۔ آواز دی تو وہ کمرے سے نکل پڑے میں نے عرض کیا کہ مولانا دریابادی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ عرض کر ہی رہا تھا کہ مولانا بھی ان کے جائے قیام پر آگئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تو خود ہی موقعہ کا منتظر تھا کہ آپ سے ملاقات کروں، آپ کی تشریف آوری سے مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ اسی درمیان رکشہ آگیا اور وہ اس پر سوار ہو کر اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ یاد نہیں آتا کہ اسٹیشن تک ان کی مشایعت کے لئے کون گیا تھا۔ یہ پیر و مرید مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علی جوہر تھے جن کو مولانا فرنگی محلی سے ارادت کا تعلق تھا، ان کو اس قضیہ کے سلسلہ میں اپنے پیر و مرشد سے بڑا شدید نظری اختلاف ہو گیا تھا اور اپنے موقف کی حمایت میں روزنامہ ''ہمدرد'' میں پے در پے بہت سے مضامین بھی لکھے تھے، لیکن اس شدید نظری اختلاف کے باوجود بھی مولانا کے جذبۂ ارادت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے پیر مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کا ویسا ہی احترام کرتے تھے جیسا پہلے کرتے تھے۔ مولانا دریابادی اس قضیہ میں مولانا محمد علی کے ہم آہنگ تھے، ممکن ہے کہ ان کی تائید میں ''صدق جدید'' میں کچھ نوٹس بھی لکھے ہوں۔ اسی پر رضا انصاری نے ایک ''طلسم ہوش ربا'' مرتب کر ڈالی۔ اور اس میں اپنی ماجد بیزاری کا خوب خوب اظہار فرمایا۔ مولانا دریابادی کے مشرقی، اسلامی دوہی علوم میں درک ہونے میں تو شاید دو رائے ہو، لیکن ان کے فلسفہ داں، فلسفہ نگار اور اردو کے ادیب وانشا پرداز ہونے میں تو کوئی دو رائے نہیں ہے۔ ہماری ایماندارانہ رائے ہے کہ پیر و مرشد کے اس نظری اختلاف کو ہوا دینے میں خدانخواستہ مولانا دریابادی کا قطعی کوئی دخل نہیں رہا

ہے۔ان کو اپنی زندگی کے ہر دور میں فرنگی محل کے تمام اکابر اور خصوصاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بڑی وابستگی رہی ہے اور وہ زندگی بھر ان کی مداحی اور منقبت سرائی کرتے رہے۔ معلوم نہیں مولانا رضاانصاری کو یکا یک ان کی طرف سے کیسے سوءِ ظن پیدا ہو گیا کہ جب اس قضیہ کو ختم ہوئے پورا ایک قرن گذر گیا تو ان کے خلاف یہ ''طلسم ہوش ربا'' لکھ دی جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

''مکتوبات سلیمانی'' مرتب مولانا عبدالماجد دریابادی کے بارے میں میرا ایک خط مولانا عبدالماجد صاحب کو

میرے پاس ''نقوش'' لاہور کے مکاتیب نمبر کی ایک جلد ہے۔ اس کے تمام خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔اس کے پہلے اور کہیں نہیں چھپے۔اس میں سرسید اور ان کے تمام نامور رفقاء سے لے کر مولانا مناظر احسن گیلانی تک کے خطوط شامل ہیں۔تعجب ہے کہ ''نقوش'' والوں کو آپ کے مکاتیب نہیں ملے۔ورنہ وہ بھی اس مجموعہ کے اوراق کی زینت ضرور بنتے۔اس کے مطالعہ کے وقت یہ کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ بہرحال میں نے مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط بہت لذت لے لے کر پڑھے۔ان خطوط کا بڑا حصہ امین زبیری کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے جو حیات شبلی کی تالیف سے متعلق ہے اور انھوں نے اس سلسلہ میں قلمی ، نسخے جو مدد کی ہے اس کا ہر خط میں ذکر اور پھر ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔

جب یہ متفرق خطوط اتنے دلچسپ ہیں تو آپ کے نام کے وہ تمام خطوط جو ابتدائے ملاقات سے لے کر اپنے نفسِ واپسیں تک آپ کو لکھے ہوں گے۔ کتنے دلچسپ اور معلومات افزا ہوں گے۔یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ان خطوط کو آپ دو جلدوں میں شائع کر رہے ہیں۔ان سے اردو کی خطوط نگاری کی صنف میں بڑا قیمتی اضافہ ہو گا اور یہ آئندہ ''حیات سلیمان'' کا بہت مستند ماخذ بھی ثابت ہو سکتے ہیں،صرف انھیں سے سید صاحب کی بایوگرافی مرتب کی جا سکتی ہے جس میں

آپ کے تشریحی نوٹ، حواشی، تعلیقات سے اور زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ ان میں آپ دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات و روابط کی پوری تفصیل ضرور آگئی ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''مکاتیب سلیمانی'' کی شکل میں میرا مدت کا ارمان پورا ہو رہا ہے۔ ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کے بعد اپنی نوعیت کا آپ کا یہ تیسرا کارنامہ ہوگا، اس کو بھی ان کتابوں کی طرح لوگ دلچسپی اور شوق سے پڑھیں گے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ لوگوں کو ان کی اشاعت سے کیوں اختلاف ہے اور آپ پر اثر ڈال رہے ہیں کہ آپ ان کو شائع نہ فرمائیں۔ میری ناقص رائے میں تو یہ تمام خطوط اصلی حالت میں آپ کے تشریحی حواشی اور فٹ نوٹس کے ساتھ ضرور شائع ہونے چاہیں۔ زندگی میں اختلاف کس سے نہیں ہوتا ہے۔ سید صاحب کو بھی قومی وملی وسیاسی مسائل میں بہت سے لوگوں سے اختلاف ہوا اور وہ اس کا اظہار مختلف صورتوں میں اور خاص طور سے ''معارف'' کے شذرات میں کرتے بھی رہے ہیں اور لوگ ان سے واقف بھی ہوتے رہے ہیں۔ حجاز کے مسئلہ میں ان کو مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی سے شدید نظری اختلاف ہوگیا تھا۔ وفد حجاز کی مطبوعہ رپورٹ میں سید صاحب کا اختلافی نوٹ موجود ہے، لیکن تعلقات برابر قائم رہے اور خط وکتابت بھی جاری رہی۔ مولانا محمد علی کے کئی خط سید صاحب کے نام ''معارف'' میں بھی شائع ہوئے ہیں جن میں انھوں نے سید صاحب کا پورا احترام ملحوظ رکھا ہے۔

سید صاحب مولانا ابوالکلام کے سفر عراق کو جس کی تفصیل انھوں نے ''کاروانِ خیال'' اور ''غبارِ خاطر'' میں بیان کی ہے۔ فرضی سمجھتے تھے اور انھوں نے ''غبار خاطر'' کے تبصرہ میں بلاخوف لومۃ لائم اس کا اظہار بھی کردیا تھا۔ اس پر ان دونوں بزرگوں کی زندگی میں اور پھر مولانا ابوالکلام کی وفات کے بعد کیا کیا فتنے نہیں اٹھے۔

ناشروں نے مولانا ابوالکلام کے مضامین کے مجموعوں میں سید صاحب اور دوسرے شریک ادارت بزرگوں کے مضامین بھی ان کا سمجھ کر شامل کردیتے تھے۔ سید صاحب نے بطور واقعہ کے جب یہ لکھا کہ ان مجموعوں میں فلاں فلاں مضامین میرے ہیں اور فلاں فلاں مولانا عبدالسلام

ندوی اور مولانا عبداللہ العمادی کے ہیں تو اس کو بھی لوگوں نے برا مانا۔ مگر سید صاحب نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور شعیب عمری نے کیا کچھ نہیں لکھا۔ اور سید صاحب کی ذات پر کیچڑ اُچھالنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن یہ ثابت ہوکر رہا کہ وہ مضامین انہی مذکورہ بالا بزرگوں کے ہیں جو غلطی سے مولانا ابوالکلام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مشہدِ اکبر نمبر(۱) کے مختلف فیہ اداریہ کو بھی تسلیم کرلیا گیا ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام کا نہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے۔ اس میں کی بعض عربی تراکیب جملوں اور الفاظ سے لوگوں کو دھوکا ہوگیا کہ وہ ابوالکلام صاحب کا ہے۔ ان کے اور سید صاحب کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے، جس کو ہر صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے، تو شروع میں سید صاحب بھی ''الہلال'' ہی کے اثر سے عربی الفاظ بہت استعمال کرتے رہے اور اس کا اثر ''ارض القرآن'' کی تالیف تک رہا، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے ان کا استعمال بالکل ترک کر دیا اور آخر میں تو بہت سادہ اور عام فہم زبان لکھنے لگے تھے اور اسی کی اپنے رفقاء اور تلامذہ کو تلقین بھی کرتے تھے۔ ان کی کتاب ''رحمت عالم'' ان کے اسی اسلوب میں ہے۔

''حیات شبلی'' کے رد میں امین زبیری مہتمم تاریخ بھوپال نے ''ذکر شبلی'' کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا تو اس سے سید صاحب کو بے حد ناگواری پیدا ہوئی اور مدت کے تعلقات ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگئے اور ان کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت سے بھی خارج کر دیا گیا۔ کراچی کے کوئی میرے ہم نام بزرگ مولوی عبدالباری بی اے علیگ امین زبیری صاحب کے رسالہ کا رد لکھنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انھوں نے سید صاحب کی رائے دریافت کی تو ان کو لکھتے ہیں:

> ''زبیری صاحب نے حضرت مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے اخلاق کا آئینہ ہے۔ میں نے ان کی کتاب نہ پوری پڑھی؛ ورنہ اس کے جواب کا ارادہ ہے، آپ اگر جواب لکھنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو روکتا نہیں تاہم میں اپنی طبیعت کی بنا پر زبیری صاحب کا اپنی موت آپ مرجانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔''

یہ خط ''نقوش'' میں بھی ہے۔ سید صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ''حیاتِ شبلی'' کے غیر متوقع تبصرہ کے بعد وہ واقعی قعرِ گمنامی میں چلے گئے، جن کا کوئی نام لیوا بھی دنیا میں موجود نہیں

ہے۔ سید صاحب کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے وردھا اسکیم کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا تھا اور انھوں نے اس اسکیم کو زندگی بھر تسلیم نہیں کیا اور اس کے خلاف برابر ''معارف'' کے شذرات میں اظہار خیال فرماتے رہے۔

سید صاحب کو صوبہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شکلا کی ودیا مندر اسکیم سے بھی اختلاف تھا اور اس کے خلاف بھی ''معارف'' کے شذرات میں برابر لکھتے رہے۔ نظری وفکری اختلاف کا اظہار کوئی برا بھی نہیں ہے، اگر سید صاحب نے اپنی فہم وبصیرت کی روشنی میں ملک وملت کے بعض مسائل میں اختلاف کیا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو یہ کوئی گناہ تو نہیں تھا کہ ان کے خلاف گندگی اُچھالی جائے۔

آپ کے نام کے سید صاحب کے خطوط میں یہی تو سب کچھ ہوگا تو آخر اس سے ڈرا کیوں جائے، تاریخ تو اپنی چیزوں سے بنتی ہے۔

ان خطوط کی اشاعت سے آپ دونوں بزرگوں کے باہمی مخلصانہ تعلقات سے دار المصنفین اور ندوہ کے باہر کے لوگ بھی واقف ہو جائیں گے اور اس سے بڑھ کر ''حیاتِ سلیمان'' کی تالیف میں بھی پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان کی اشاعت کا ہر صاحب ذوق کو خیر مقدم کرنا چاہئے۔ ان کی اشاعت کو راہ میں محض فتنوں کے اٹھنے اور سید صاحب کے خلاف گندگی کے اچھالنے کے ڈر سے کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرنی چاہئے۔ اگر خدانخواستہ فتنے اٹھے اور گندگی اچھالی گئی تو اس کے مقابلہ کے لئے بالکل تیار رہنا چاہئے۔ سید صاحب کی مدافعت ہمارا اخلاقی فریضہ بھی ہے۔ ہم ان کی طرف سے واقعات وحقائق کی روشنی میں دفاع نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔

(''صدق جدید'' کے شمارہ یکم نومبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام خط

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ مجھے افسوس اور ندامت ہے کہ میں اب تک ''مکتوبات سلیمانی'' سے متعلق آپ کا مختصر ترین والا نامہ کا جو مجھے شاہ صاحب سے مولانا سید ابوالحسن ندوی کی موجودگی میں ملا تھا، جب کہ وہ ضلع دینی تعلیمی کانفرنس اعظم گڑھ کے افتتاح کے لئے دسمبر ۱۹۶۳ء کے اوائل میں اعظم گڑھ آئے تھے، جواب نہ دے سکا، میں اس وقت علی میاں سے نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ انھوں نے میری خیریت پوچھی اور فرمایا کہ ادھر عرصہ سے آپ کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا، مجھے یہ سن کر تعجب ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''مکتوبات سلیمانی'' کی اشاعت سے متعلق میرا مراسلہ جو یکم نومبر ۱۹۶۳ء کے ''صدق'' میں آپ نے ازراہِ قدر دانی شائع فرمایا تھا، اس وقت تک شاید موصوف کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔ اپنے اس تائیدی مراسلہ سے متعلق جن لوگوں کے تاثرات کا انتظار تھا ان میں ایک علی میاں بھی تھے مگر ان کی نظر سے وہ مراسلہ گذرا ہی نہیں تو ان کا خط کیا آتا۔ ابھی تک دو بزرگوں کے خط آئے ہیں، جنھوں نے میرے مراسلہ کی اشاعت پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ان میں ایک سید نجیب اشرف صاحب ندوی ہیں جن کی خدمت میں میں بہت زیادہ بے تکلف ہوں، وہ یہاں ابھی ۲۳ برس کے بعد آئے تھے اور ''رقعات عالمگیری'' کے دوبارہ ترتیب دینے اور ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ مجھ سے فرمایا تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی جواب بہت کم رہ گئی ہے، اسی کام کے نذر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اگر چہ ریٹائر ہوں مگر اللہ کے فضل سے فارغ البال ہوں، معاش کی فکر دامن گیر نہیں ہے۔ یہ کام بمبئی میں بھی بیٹھ کر انشاء اللہ انجام دوں گا۔ جہاں مجھ کو ہر طرح کا فراغ، سکون اور اطمینان حاصل ہے۔ صحیح ہے کہ بمبئی میں کوئی اچھا مشرقی کتب خانہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے مواد وغیرہ کی فراہمی میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی، لیکن ان پر قابو پانے کی کوشش کروں گا۔ پچھلے تلخ تجربات کی بنا پر اس

کام کے لئے دارالمصنفین میں قیام کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔

دوسرے بزرگ ڈاکٹر محمد عزیر سابق رفیق دارالمصنفین ہیں، جنھوں نے شاہ صاحب کو لکھا ہے: ''فلاں تاریخ کے ''صدق جدید'' میں ''مکتوبات سلیمانی'' کی اشاعت کی تائید میں مراسلہ پڑھ کر تعجب ہوا۔ یعنی آپ لوگوں کی مخالفت کے علم کے باوجود اس مراسلہ کو لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی۔''

عزیر صاحب کا تعلق سید صاحب سے محض ایک رفیق کی حیثیت سے رہا ہے۔ ان کی مخالفت محض ان حضرات کی مخالفت کی وجہ سے ہے، اس کے سوا اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا، لیکن سید نجیب اشرف صاحب کی مخالفت سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ سید صاحب کے ہم وطن عزیز اور ان کے ادب و انشاء کے پرستار ہیں، انہی کے سایہ شفقت میں ان کو قلم پکڑنا آیا۔ انہی کے سایہ شفقت میں جنگِ جانشینی تک کے رقعات عالمگیر پر انھوں نے اتنا گرانقدر مقدمہ لکھا جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان کو اور سید صاحب کے ان قیمتی توشہائے گرامی کی اشاعت سے کیوں اختلاف ہے۔ یہ سمجھ مین نہیں آیا۔ میں ان کو اس سلسلہ میں ایک خط بھی لکھنے والا تھا مگر اس خیال سے کہ کہیں وہ خدانخواستہ میرے لئے مزید مصیبت و ابتلا کا کہیں سبب نہ بن جائے۔ اس لئے لکھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے۔

اس بیش قیمت مجموعہ مکتوبات پر مضامین، مراسلات، تبصروں اور تنقیدوں کو بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھ رہا ہوں اور علم و ادب کی ان غیر معمولی شخصیتوں کے پیش نظر کوئی اس مجموعہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا، دو معاصر بزرگوں کی پچاس سالہ خط و کتابت اور اس سے متعلق آپ کے توضیحی حواشی اور تعلیقات کے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا کون شائق نہ ہوگا۔ ارباب نظر جس گرم جوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کر رہے ہیں وہ توقع کے عین مطابق ہے۔

سید صاحب کے دو مجموعہ خطوط اس سے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں، ایک وفد خلافت کے ساتھ سید صاحب کے سفر یورپ کے خطوط کا مجموعہ جس کو انہی کے قائم کردہ مکتبہ الشرق کراچی نے ''برید فرنگ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ایک مولانا مسعود عالم ندوی کے نام کے خطوط کا مجموعہ جس

کو مرحوم نے سید صاحب کی وفات کے فوراً ہی بعد شائع کیا تھا۔ ندوہ کے تمام فارغین میں سید صاحب انہی کو سب سے زیادہ مانتے تھے اور عزیز رکھتے تھے۔ ان کا کوئی مضمون ''معارف'' میں چھپنے کے لئے آتا تھا تو باغ باغ ہو جاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ پورے کا پورا ایک ہی مرتبہ شائع ہو جائے خواہ وہ کتنا ہی طویل ہوتا۔ ''حیات سلیمان'' کے لئے جن لوگوں کے نام میرے ذہن میں تھے، ان میں ایک یہ مسعود عالم ندوی بھی تھے، جن کی زندگی نے افسوس ہے کہ وفا نہیں کی، ورنہ اس کام کو ان سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا تھا۔

ان دونوں مجموعہ خطوط کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم لیکن ان کو کسی نے جانا اور کسی نے نہیں جانا، لیکن آپ کے نام کے خطوط کے مجموعہ شائع ہونے کی خبر مشتہر ہوئی تو کاتب اور مکتوب الیہ دونوں کی شخصی اہمیت، شہرت اور عظمت کی بنا پر سارے ملک میں دھوم مچ گئی اور شبلی اسکول کا ایک ایک اہل نظر اس کے لئے تو سراپا انتظار بن گیا۔

میرے نزدیک اس کی اہمیت مختلف حیثیتوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے ثقہ مصنف اور اہل قلم کے خطوط ہیں دوسرے یہ کہ آپ جیسے طرز انشاء پرداز، ادیب اور فلسفی کے نام ہیں، تیسرے یہ کہ ان خطوط پر آپ کے توضیحی حواشی، تعلیقات اور فٹ نوٹس ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ آپ دونوں معاصر بزرگوں کے باہمی تعلقات اور ان کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ ہر خط کا پس منظر سامنے آجاتا ہے جس سے قاری کا لطف اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ سید صاحب نے سب سے زیادہ خط اپنے ہم وطن دوست اور بچپن کے ساتھی اور رشتہ کے چچا سید ابوالکمال دسنوی کو لکھے ہیں لیکن اس مجموعہ کے مقدمے کے شائع ہونے کے بعد مجھے بالکل پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ انھوں نے آپ کو بھی دیسوی صاحب سے کم خط نہیں لکھے ہیں۔ جس طرح انھوں نے سید صاحب کا ایک ایک رقعہ حرز جاں بنا کر رکھا، اسی طرح آپ نے بھی حتی الامکان اپنے لائق وفاضل دوست اور قلمی وادبی معاصر کے نوشتوں کو بھی ضائع ہونے نہیں دیا۔ یہ بجائے خود سید صاحب کے ساتھ آپ کے انتہائی خلوص ومحبت کا غیر معمولی ثبوت ہے جس کو کوئی غیر جانب دار تبصرہ نگار اس مجموعہ نوادر پر تبصرہ کرتے وقت نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس

پر مستزاد یہ کہ ان تمام خطوط کو جو دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئے تھے صاف کرانا۔ زمانہ کے اعتبار سے مرتب کرنا، پھر ناظرین کی سہولت کے لئے جہاں جہاں ضرورت تھی توضیحی حاشیے لکھنا اور پھر شائع کرنا کاتب کے ساتھ شغف، محبت اور تعلق کی کئی بڑی شہادت ہے۔ جس کے لئے آپ پاکستان اور ہندوستان کے تمام وابستگان دامنِ سلیماں کے شکریہ کے مستحق ہیں اور وہ بحمداللہ اس علمی، ادبی خدمت کی انجام دہی پر آپ کو خراج تحسین پیش بھی کر رہے ہیں، خدا کرے کہ اس کی دوسری جلد بھی آپ کے قیمتی حواشی وتعلیقات کے ساتھ جلد سے جلد منظر عام پر آجائے اور شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے، جن کو یقیناً اس جلد کے شائع ہونے کے بعد اس کا شدید انتظار ہوگا۔

میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سید صاحب کے افاداتِ قلم کی اشاعت کی تائید لائق تعزیر اور موجب عتاب بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے تو سید صاحب کی ذات کے ساتھ اتنی عقیدت ہے کہ چاہتا ہوں کہ ان کے قلم کی ہر چیز پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آجائے۔ یہ تو ایسے بیش قیمت خطوط کا مجموعہ ہے جو سیرت سلیمانی کا مستند ترین ماخذ بن سکتا ہے اور جس نے سید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

مجھے ابھی تک مولانا مسعود علی ندوی کی خدمت میں جانے کا تو اتفاق نہیں ہوا ہے کہ میں ان کا ردعمل معلوم کر سکتا، لیکن صباح الدین صاحب نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ کیا تم کو اس سلسلہ میں ہم لوگوں کے خیالات کا علم نہیں تھا۔ ان کو سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پرائیوٹ اور حد درجہ رازدارانہ خط کے حاشیہ میں شائع کرنے اور طشت ازبام کرنے پر اعتراض ہے کہ حامیان ابوالکلام اس کو پاکر سید صاحب کے خلاف کیا کیا فتنہ آرائی کریں گے اور ان پر کیا کیا کیچڑ اچھالیں گے۔ مجھے اس وقت تک علم نہیں تھا کہ وہ مولانا آزاد کا کون سا خط ہو سکتا ہے جس کی اشاعت کسی فتنہ کا سبب بن سکتی ہے، اس کو تو میں نے جامعہ دہلی میں عبداللطیف اعظمی صاحب کے تبصرہ میں دیکھا جس کو انھوں نے کس مصلحت سے من وعن نقل کر دیا ہے۔

شاہ صاحب اب تک کئی بار اپنی خدمت میں بلا کر اپنی برہمی اور غصہ کا اظہار کر چکے ہیں کہ ان خطوط کی اشاعت کی تائید میں تمہارے مراسلہ کا شائع ہونا ایسا گناہ ہے جو بخشا نہیں جا سکتا۔

تم کو ہماری پالیسی پر چلنا چاہئے، ہم لوگ ان کی اشاعت پسند نہیں کرتے، اس کے جواب میں میں ان سے عرض ہی کیا کرسکتا ہوں اولاً تو میں اس معاملہ میں ان لوگوں کو اتنا سنجیدہ نہیں سمجھتا تھا، دوسرے میں اس کو نظری اختلاف سمجھتا تھا جس کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ خود مولانا مسعود علی ندوی جیسے جبار وقہار بزرگ سے بارہا سیاسی وقومی معاملات میں نظری اختلاف رہ چکا ہے اور انھوں نے اپنی شرافت سے کبھی کوئی نوٹس نہیں لیا۔ نہ میرے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا اور نہ کبھی ملامت کی۔ میرے وہم میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ فکر ونظر کا یہ اختلاف موجودہ ذمہ داران دار المصنفین کے مستقل عتاب وناراضگی کا سبب بن جائے گا اور مجھ پر اتنا شدید عتاب نازل ہوگا۔ یہاں کی چالیس سالہ ملازمت میں جب سے شاہ صاحب کا اس ادارہ سے تعلق ہوا ہے، اختلاف رائے تو بڑی بات ہے، اختلاف فکر ونظر کی بھی نوبت نہیں آتی۔ یہ بالکل پہلا اتفاق ہے کہ ایک ادنیٰ معاملہ میں جس کا بظاہر ان کی ذات سے یا اس ادارہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اختلاف کی نوبت آئی اور انھوں نے حیرت انگیز طور پر اتنا اثر لیا کہ میری سالہا سال کی وفاداری ان کی نگاہ میں مشتبہ ہوگئی۔ ان کا یہ تاثر کہاں تک صحیح ہے۔ میں اس کا فیصلہ آئندہ مؤرخ پر چھوڑتا ہوں۔

(یہ خط ۱۹۶۴ء میں لکھا گیا)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام میرا خط

''مکتوباتِ سلیمانی'' پہلی جلد کے شائع ہونے پر

''مکتوبات سلیمانی'' یا اسے صحفِ سلیمانی سے تعبیر کروں، ان کی اشاعت کا جتنا شوق وانتظار مجھے رہا ہوگا شاید ہی کسی اور کو رہا ہو۔ لیکن بصد شوق وانتظار اور بصد آرزو وتمنا اس کی پہلی جلد دار المصنفین میں آئی تو میں اب تک اس کی زیارت اور مطالعہ کی سعادت سے محروم ہوں۔

میں نے مکتوبات کا مقدمہ ''صدق جدید'' میں پڑھا جس میں آپ نے سید صاحب کے

بعض خطوط کی اشاعت پر اپنے تذبذب اور سید صاحب سے حشر میں شرمسار ہونے کا جو اظہار فرمایا ہے اس نے ان مفید ترین خطوط کی اشاعت کو ایک مختلف فیہ مسئلہ بنادیا ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو ان خطوط کی اشاعت کے لئے اتنی صفائی کی کیا ضرورت تھی، اگر آپ کا ضمیر خدانخواستہ مطمئن نہ تھا تو بہتر یہی تھا کہ آپ ان کو شائع نہ کرتے اور جب آپ نے ازراہِ اخلاص ومحبت ان کے شائع کرنے کا ارادہ ہی کرلیا تھا تو پھر ان پر اظہار تذبذب کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ غالب، شبلی واقبال کے خطوط کے مجموعوں کے شائع ہونے کے بعد خدا جانے کتنے اور لوگوں کے خطوط کے مجموعے شائع کئے گئے مگر ان کے شائع کرنے والوں نے کسی خط کے متعلق اس طرح سے تذبذب اور شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا۔

سید صاحب کے یہ خطوط آپ کے نام تھے اور آپ ہی ان کے قانوناً اور اخلاقاً شائع کرنے کے مجاز تھے، اگر آپ تذبذب وتردد کے اظہار کے بغیر ان کو شائع فرمادیتے تو کسی کو اس سے اختلاف کرنے کا موقع نہ ملتا۔ افسوس ہے کہ ''صدق جدید'' میں مقدمہ شائع کر کے آپ نے خود یہ موقع فراہم کردیا اور لوگوں کا منھ کھل گیا۔ اب کس کس کا آپ منھ بند کرسکتے ہیں اور پھر آپ خدانخواستہ کوئی گناہ تو کرنے جا نہیں رہے تھے کہ لوگ پیچھے پڑ گئے۔ لوگوں کو تو خوش ہونا چاہئے کہ سید صاحب کی لائف کے لئے ایک مستند ترین ماخذ منظر عام پر آگیا جس سے سید صاحب کے سوانح وحالات لکھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا تھا کہ سید صاحب نے سب سے زیادہ اپنے دیرینہ کے ساتھی اور عزیز سید عبدالحکیم صاحب کو خط لکھے ہیں لیکن مقدمہ پڑھنے سے پتہ چلا کہ انھوں نے آپ کو بھی ان سے کم خط نہیں لکھے جن کی تعداد کچھ ضائع ہونے کے باوجود بھی بحمداللہ تین سو سے زیادہ ہے۔ اس سے ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ آپ سے کتنا تعلق رکھتے تھے۔ ان کے تعلق کی سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ وفد خلافت کے رکن ہو کر یورپ تشریف لے گئے تو ''معارف'' کی ادارت اور رفقاء کی نگرانی آپ کے سپرد کر کے اور جب تک وہ وہاں سے واپس نہیں آئے ''معارف'' کے شذرات آپ ہی لکھتے رہے، بلکہ ان کے آنے کے بعد بھی ایک آدھ مہینہ اس کا سلسلہ قائم رہا۔

آپ نے سید صاحب کے ان خطوط کو اپنے قیمتی حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع کر کے سید صاحب کے ساتھ اپنی دوستی، محبت واخلاص کا حق ادا کردیا ہے جس کے لئے سید صاحب کے تمام عقیدت مندوں کو آپ کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ سید صاحب کے قلم کے یہ تبرکات منظر عام پر نہ آتے تو ان کی زندگی کے بہت سے گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائے اور ان کی سوانح حیات مکمل نہ ہوتی۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کو ایک خط

''مکتوباتِ سلیمانی'' کی دونوں جلدوں کی اشاعت پر

رقمیہ گرامی علی میاں کی موجودگی میں جب کہ میں ان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا تھا، مولانا شاہ معین الدین صاحب نے یہ کہہ کر مجھے عنایت کیا کہ لیجئے مولانا ماجد صاحب کا خط آپ کے اس مراسلہ کی اشاعت کے بعد اب اپنی کتاب کی اشاعت پر آپ کی داد کے طالب ہیں۔

اس کی داد تو میں کیا اردو کے بڑے بڑے ادیب وانشا پرداز اور اہل قلم انشاء اللہ دیں گے اور اس پر بہت ہی حوصلہ افزا ریویو اخبارات ورسائل میں نکلیں گے اور اس عظیم ادبی خدمت کے انجام دینے پر آپ کو سراہیں گے اور آپ کی تعریف کریں گے۔ اس کی قیمت اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ ایک معاصر کے خطوط دوسرے معاصر کے نام ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم وادب کا یکساں ذوق بخشا تھا، دونوں ہی مولانا شبلی کی بزم کمال سے مستفید ہوئے تھے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے قدرداں اور عظمت شناس تھے اور دونوں ہی کو اللہ تعالیٰ نے شہرت وعزت، نام ونمود اور مقبولیت سے نوازا تھا۔ افسوس ہے کہ ان میں سے ایک کا سلسلہ قبض موت کے بے رحم ہاتھوں نے منقطع کردیا اور ایک کا بحمد اللہ جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ چشمۂ فیض مدت دراز تک جاری رہے اور طالبانِ علم وادب آ آ کر اس سے سیراب ہوتے رہیں۔

سید صاحب کا معتمد علیہ بلکہ محرمِ راز آپ سے بڑھ کر اور کوئی دوسرا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دیسنہ کے سید عبدالحکیم صاحب کے بعد سب سے زیادہ خطوط آپ کو لکھے تھے اور وہ یورپ میں جہاں جہاں رہے آپ کی یاد سے غافل نہیں رہے اور آپ کو خطوط لکھتے رہے جن کی تعداد بہت زیادہ گم ہوجانے کے باوجود ۳۰۰ باقی رہ گئی تھی اور ان کی وفات کے بعد اپنے گرانقدر حواشی وتعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ نہایت اہتمام سے دو جلدوں میں شائع کردیئے جس کے لئے عقیدت مندانِ سید آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں کم ہے۔

اگر آپ نے سید صاحب کے بعد خطوط کی اشاعت پر اپنے مقدمہ میں خواہ مخواہ تذبذب کا اور آخرت میں شرمسار ہونے کا ذکر نہ فرمایا ہوتا تو لوگوں کو آپ کی ذات کو مجروح کرنے کا ہرگز ہرگز موقع نہ ملتا۔ آپ نے مقدمہ میں شک وتذبذب کا اظہار کرکے لوگوں کو چھیڑنے کا خود موقع دیدیا۔

مولانا ابوالکلام کا جو خط آپ نے فٹ نوٹ میں شائع فرمایا ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مکتوبات سلیمانی کے ساتھ اس کے شائع کرنے کی کیا مصلحت ہے۔ یہ خط تو بہت ہی پرائیویٹ اور رازدارانہ تھا۔ مشاہیر کے خطوط سید صاحب کے پاس کراچی بھیجنے کے لئے صباح الدین صاحب نے اکٹھا کئے اور مجھے نقل کرنے کے لئے دیئے تو مولانا ابوالکلام کے خطوط کے ذخیرہ میں یہ خط بھی تھا جس میں مولانا ابوالکلام نے اپنی تمام کوتاہیوں کا بہت کھلے دل سے اعتراف کیا تھا جس کا ایک ایک حرف ان کی بلندی فطرت کا غماز تھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سید صاحب نے اس کا کیا جواب دیا ہوگا۔ اس خط کے نقل کرنے میں مجھے تامل ضرور ہوا لیکن میں نے اس کو بھی نقل کرلیا، لیکن صباح الدین صاحب نے یہاں کے کسی اور صاحب سے اس خط کا ذکر نہیں کیا۔ سید صاحب کے انتقال کے بعد مولانا ابوالکلام کے خطوط کے "معارف" میں شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا تو شاہ صاحب کو اس ذخیرہ میں یہ خط بھی مل گیا اور اس کو اور اس طرح کے اور دوسرے خطوط کو الگ کرلیا اور ان کا شائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ جب کبھی یہاں تشریف لائے ہوں گے تو چونکہ وہ خود بھی مولانا ابوالکلام سے بہت زیادہ عقیدت نہیں رکھتے تھے، اس لئے کسی صحبت میں سید صاحب کی ذات کے

ساتھ فرطِ اخلاص کی بنا پر آپ سے بھی اس خط کا ذکر کر دیا جس کے حاصل کرنے کی آپ کے دل میں اسی وقت غالباً طلب پیدا ہوئی اور جب ''مکتوبات سلیمانی'' کی ترتیب کے وقت اس کا خیال آیا تو آپ نے شاہ صاحب کو خط لکھ کر اس کی نقل منگوا لی اور انھوں نے بجائے مجھ سے نقل کرانے کے مولوی ضیاء الدین اصلاحی سے نقل کرا کے بلا اس خیال کے کہ اس نقل کی آپ کو کیا ضرورت ہے انھوں نے آپ کی فرمائش کی تعمیل میں آپ کے پاس بھیج دیا۔ اسی زمانہ میں شاہ صاحب نے مولانا ابوالکلام کے خلاف مجھ سے ایک مضمون لکھوایا تھا جس کو آپ نے بھی ''صدق جدید'' میں اور مولانا ماہر القادری نے بھی ''فاران'' میں شائع کرنے سے معذرت کر دی تھی، لیکن انھوں نے از خود کراچی کے ایک مقبول اور کثیر الاشاعت رسالہ ''کہکشاں'' میں شائع کرنے کے لئے بھیج دیا اور اس نے بڑے آب و تاب سے شائع کیا۔

مقصود یہ ہے کہ اس وقت دونوں آدمی یعنی آپ اور شاہ صاحب مولانا ابوالکلام کے بارے میں متحد الخیال تھے ورنہ اس راز دارانہ خط کی نقل کو آپ کے پاس بھیجنے میں ان کو ضرور تامل ہوتا۔ افسوس ہے ان مکتوبات کے ساتھ اس خط کی اشاعت سے آپ کی ذات کو شدید نقصان پہنچ گیا۔ اس کی اشاعت کو یہاں کے لوگوں نے بھی پسند نہیں کیا۔ ایسے راز دارانہ خط کے فاش ہونے کا جہاں تک تعلق ہے اس کے ذمہ دار آپ دونوں ہی بزرگ ہیں نہ شاہ صاحب نے ابوالکلام دشمنی میں اس کی نقل آپ کے پاس بھیجی ہوتی نہ آپ کو اس کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوتا اور پھر اس کا تعلق دور و قریب سے بھی ''مکتوبات سلیمانی'' سے تھا بھی نہیں۔

☆☆☆

سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے نام خط
''مکتوبات سلیمانی'' کے بارے میں

میں نے ''مکتوبات سلیمانی'' بنام مولانا دریابادی کی اشاعت کی تائید میں مولانا دریابادی کو جو پرائیویٹ خط لکھا تھا اور جس کو انھوں نے از راہِ قدر دانی و ذرہ نوازی ''صدق جدید'' میں بھی شائع کر دیا وہ بدقسمتی سے میرا بہت بڑا جرم قرار دیا گیا اور شاہ معین الدین صاحب نے مجھ پر ایسی لے دے کی کہ میں حیران ہو گیا کہ آخر مجھ سے کیا جرم سرزد ہو گیا جس پر شاہ صاحب اتنے زیادہ برہم ہیں۔ سید صاحب کے کسی نگارش قلم کی اشاعت کی تائید باعثِ سعادت ہے یا موجب تعزیر و عقوبت۔ یہ میں اب تک سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاہ صاحب کا رویہ میرے ساتھ اتنا سخت ہو گیا کہ انھوں نے مالی نقصان تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بخلاف اس کے صباح الدین صاحب نے اس کے متعلق بھولے سے بھی مجھ سے باز پرس نہیں کی۔ گو وہ خود بھی ان خطوط کی اشاعت کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، اتنا ضرور کہا کہ ماجد میاں نے ان خطوط کی اشاعت میں آپ کا سہارا لیا ہے کہ بہر حال اس ادارہ کا ایک شخص اس کی تائید میں ہے۔

بہر حال معاملہ ماجد میاں کی کسی کتاب، کسی تحریر، کسی مضمون اور کسی مکتوب کی اشاعت کا نہیں۔ سید صاحب علیہ الرحمہ کے خطوط کی اشاعت کا تھا جو مولانا دریابادی کے نام تھے اور جن کو اپنے اور سید صاحب کے پچاس سالہ تعلقات محبت و یگانگت کی یادگار میں شائع کرنا چاہتے تھے، جس کا ان کو بالکل حق تھا۔ اس سے پہلے مولانا مسعود عالم ندوی اپنے نام کے خطوط سید صاحب کی وفات کے چند ہی مہینہ کے بعد شائع کر چکے تھے۔ اگر ماجد صاحب بھی اپنے نام کے سید صاحب کے سارے خطوط جن کو انھوں نے بڑے اہتمام سے محفوظ رکھا تھا شائع کرنا چاہتے تھے تو اس میں

برائی کی کیا بات تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب اتنے سیریس (Serious) اور سنجیدہ ہو گئے کہ گویا مولانا ماجد کوئی بہت بڑا گناہ کرنے جارہے ہیں، مجھے یہاں کے لوگوں کی مخالفت کی سن گن ضرور لگی تھی لیکن میں سمجھتا تھا کہ یہ محض نظریاتی اختلاف ہے جس کی چنداں کوئی اہمیت نہیں ہے میں مسلمانوں کی پچھلی ملی تحریک میں سوادِ اعظم کے ساتھ تھا اور برابر اس کی تائید میں تمام اخبارات میں جو اس کے مؤید تھے، مضامین لکھتا رہا اور کبھی کبھی لہجہ سخت بھی ہو جاتا تھا لیکن مولانا مسعود علی ندوی نے جو اس تحریک کے سخت مخالف تھے کبھی کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ جب یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو مجھ کو اپنے دفتر میں بلا کر مبارک باد دی، اسی طرح کا نظری اختلاف میں نے اس کو بھی سمجھا اور ان خطوط کی اشاعت کی تائید میں مولانا ماجد کو ایک خط لکھ دیا جس کے متعلق مجھے وہم بھی نہیں ہوا کہ اس کو وہ ''صدق جدید'' میں شائع بھی کر دیں گے۔ مگر انھوں نے بغیر کسی اصلاح و ترمیم واضافہ کے من وعن شائع کر دیا۔

مجھے بتایا گیا کہ آپ بھی ان خطوط کے شائع کرنے کے حق میں نہیں تھے اور جب آپ یہاں آئے تھے تو اس مسئلہ پر ان لوگوں سے تبادلہ خیال بھی ہوا تھا جس کا مجھے اپنی بیماری اور کتب خانہ سے مسلسل غیر حاضری کی وجہ سے علم نہ ہو سکا اور شاید اس وقت ان خطوط کی اشاعت وعدم اشاعت کا مسئلہ اتنا سنگین اور اہم بھی نہ تھا جو اب بنا لیا گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ''صدق جدید'' کے میرے اس مراسلہ پر آپ نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ جہاں سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے وہاں سے اس کی تائید میں کیسے آواز اٹھ گئی۔ میرے اس مراسلہ کی اشاعت سے پہلے ان مکتوبات کی ایک جلد شائع ہو چکی تھی اور قدر دانوں نے ہاتھوں ہاتھ فرطِ شوق میں خریدنا شروع بھی کر دیا تھا۔ اس لئے یہ کہنا اور یہ سمجھنا کہ ماجد میاں نے مجھ جیسے حقیر کا سہارا ڈھونڈا اور میرا یہ مراسلہ ان خطوط کی اشاعت کا سبب اور محرک تھا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی اس کو باور کر سکتا ہے۔ میرا اپنا خیال اب بھی یہی ہے کہ ماجد میاں نے اپنے نام کے ان گرانقدر خطوط کو شائع کر کے قطعاً کوئی جرم نہیں کیا ہے جس کا ان سے مواخذہ لیا جائے اور ان سے تعلقات منقطع کر لئے جائیں۔ ان خطوط سے سید صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ ان سے ''حیات سلیمان'' کی تالیف

میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ سید صاحب کے خطوط سے بڑھ کر ''حیات سلیمان'' کا ماخذ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حیات شبلی کا خاکہ مولانا شبلی کے خطوط ہی سے تیار کیا گیا تھا جس میں بعد میں سید صاحب نے اپنے قلم سے رنگ بھرا۔ اسی طرح حیات سلیمان کا خاکہ بھی سید صاحب کے خطوط سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ مولانا ماجد نے یہ خطوط شائع کر کے حیاتِ سلیمان کے لئے ایک مستند ماخذ مہیا کر دیا ہے۔ جس کے لئے ہم سب کو ان کا شکر گذار ہونا چاہئے۔ (یہ خط نومبر ۱۹۶۳ء میں لکھا گیا)

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عزیر صاحب سابق رفیق دارالمصنّفین کے نام خط

''مکتوباتِ سلیمانی'' کے بارے میں

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ''مکتوباتِ سلیمانی'' کے متعلق ''صدق جدید'' میں میرا جو مراسلہ شائع ہوا ہے اس پر آپ کو بھی بہت تعجب ہوا کہ جب سب لوگ ان کی اشاعت کے مخالف تھے تو تائید میں وہیں سے یہ آواز کیسے اٹھ گئی۔ آپ کے استعجاب کا ذکر خود شاہ معین الدین صاحب نے کیا۔ مکتوبات سلیمان کی ترتیب وتدوین کا کام ایک عرصہ سے جاری تھا جس کی روداد بھی برابر ''صدق'' کی ہر اشاعت میں خود مولانا کے قلم سے برابر شائع ہوتی رہی اور لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے بھی رہے اور ان کے شائع ہونے کے مشتاق بھی ہو گئے لیکن جوں ہی مولانا نے اس کا مقدمہ ''صدق جدید'' میں شائع کیا جس میں یہ لکھا کہ ہو سکتا ہے کہ بعض خطوط سے لوگوں کو شکایت پیدا ہو جائے کہ تعلقات ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہتے، بنتے اور بگڑتے بھی رہتے ہیں۔ اس لئے ان خطوط کو تعلقات کے اسی اتار چڑھاؤ کی روشنی میں پڑھنا چاہئے۔ ان خطوط کی اشاعت کی مخالفت شروع ہو گئی اور مولانا پر طعن وتعریض کے تیر برسائے جانے لگے۔ مولانا جلد لوگوں کے اس تیر ونشتر کا جواب کیا دے سکتے تھے، خاموش ہو گئے جو کام وہ ایک عرصہ سے انجام دے رہے تھے اس کو

لوگوں کے کہنے سننے سے بھلا کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ جب کہ اس کی ایک جلد شائع بھی ہوگئی تھی۔ وہ ان خطوط کے شائع کرنے کے ہر طرح مجاز تھے اگر انھوں نے شائع کر دیا تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ خطوط حیات سلیمان کا بہت مستند ماخذ بن سکتے ہیں جن سے کسی حال میں صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم سب کو تو ان کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ ان کی بدولت مولانا شبلی کے مکاتیب کی طرح ان کے خطوط بھی شائع ہو گئے اور صنف خطوط نگاری کے ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہوا، یہ اگر شائع نہ ہوتے تو سید صاحب کی زندگی کے بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے۔ ہر حیثیت سے یہ اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے اپنے صرفہ سے سید صاحب کے اپنے نام کے سارے خطوط جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے اُسے توضیحی حواشی وتعلیقات کے ساتھ شائع کر دیئے، ان کے شائع کرنے پر وہ کسی ملامت کے مستحق نہیں ہیں جو ان کو ہدف ملامت بنالیا گیا ہے اور ان کے اس اقدام کو پسند نہیں کیا جارہا ہے۔

جس طرح سید صاحب مرحوم مغفور نے اپنے استاد مولانا شبلی کا ایک ایک حرف شائع کیا اسی طرح میں چاہتا تھا کہ سید صاحب کا بھی تمام تحریری سرمایہ جو مختلف رسالوں، پرچوں اور اخباروں میں منتشر ہے یا ابھی غیر مطبوعہ ہے یا خطوط کی شکل میں ہے بتدریج منظر عام پر آجائے اور جس طرح سید صاحب نے مولانا شبلی کے مکاتیب کو جمع کیا اور ترتیب دیا اور ان کی دو جلدیں شائع کیں اسی طرح سید صاحب کے منتشر یا غیر مطبوعہ افاداتِ قلم کی اشاعت کی ابتدا بھی ان کے مکاتیب کے جمع وترتیب وطبع واشاعت سے ہو۔ جن کا بڑا حصہ قدر دانوں کے پاس محفوظ ہوگا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ یہ کام دار المصنفین میں ہو کہ ندوہ اور دار المصنفین کا حلقہ ہی اتنا وسیع ہے کہ کہ اگر اسی حلقہ کے لوگوں کے نام کے خطوط جمع کئے جائیں تو ایک اچھی خاصی جلد تیار ہوسکتی ہے، مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، نواب علی حسن خاں، منشی احتشام علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مہدی حسن افادی الاقتصادی، مولانا سید عبدالحئی حسنی، ڈاکٹر عبدالعلی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، سید نجیب اشرف ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، خود مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی موجودہ ناظم دار المصنفین جن کو اپنی زندگی ہی میں سید صاحب نے اپنا علمی جانشین بنادیا تھا۔ ایک خط میں

سید صاحب ان کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

''آپ کے لکھے ہوئے شذرات میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اب اس میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہ گیا ہے۔''

یہ شاہ صاحب کے لئے باوجود اس کے کہ وہ خود بھی ماشاء اللہ اب ایک درجن کتابوں کے مصنف ہیں، بہت بڑا تمغۂ امتیاز ہے جس پر وہ جتنا ناز کریں کم ہے۔

جب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مجھ کو سید ابوالکمال عبدالحکیم دسنوی کے نام کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ تاریخ وار مرتب کرنے اور نقل کرنے کے لئے دیا اور میں نے ان کو پڑھا تو مجھے ان مکاتیب کی اشاعت کی اور زیادہ خواہش پیدا ہوئی کہ جب دیسنہ کے ایک بزرگ کے نام دو ڈھائی سو خط ہیں تو اس مردم خیز بستی کے اور لوگوں کے نام کے خطوط جمع کئے جائیں تو کتنے ہو جائیں گے۔ اس طرح دیسنہ کی نسبت سے مکاتیب کی ایک ضخیم جلد مرتب ہو سکتی ہے، میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار اپنے اس تعزیتی مضمون میں بھی کیا جو میں نے سید عبدالحکیم صاحب مرحوم کی وفات پر ''ہماری زبان'' علی گڑھ میں لکھا تھا اور خاص طور پر اس کی طرف سید شہاب الدین دیسوی وانجمن اسلام بمبئی کے سکریٹری ہیں توجہ دلائی مگر میری خواہش کا پورا ہونا تو میرے بس میں نہ تھا، اس لئے مولانا مسعود عالم ندوی کے نام کے مختصر ترین مجموعہ خطوط کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام کے خطوط کے جمع و ترتیب اور طبع و اشاعت کا مژدہ ''صدق جدید'' میں میری نظر سے گذرا تو قدرتی طور پر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور جب ان کی تعداد معلوم ہوئی تو میں فرطِ مسرت سے اُچھل پڑا کہ ان بزرگ کے نام کے خطوط سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ اگر یہ شائع ہو گئے تو زیرِ تالیف حیات سلیمان کے لئے ایک بہت مستند ماخذ ہاتھ آ جائے گا کہ حیاتِ شبلی کے جہاں اور بہت سے ماخذ ہیں جن سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور جن کا کتاب میں اعتراف بھی کیا گیا ہے، خود مولانا شبلی کے خطوط بھی تھے۔ اسی طرح سید صاحب کے ذاتی خطوط بھی سید صاحب کی سیرت نگاری کے کام آ سکتے ہیں۔ ابھی میری خوشی دل ہی دل میں تھی کہ ''مکتوبات سلیمانی'' کی پہلی جلد پر مولانا دریابادی نے جو مقدمہ لکھا تھا وہ کتاب کے شائع ہونے سے پہلے ہی ''صدق جدید'' میں شائع کر دیا اور اس میں

کچھ ایسی باتیں بھی بعض خطوط کی توجیہ وتاویل میں لکھ دیں جن سے ان کا پورا مقدمہ محل اعتراض بن گیا اور اس پر اخبارات میں مضامین کا ایک ناگوار سلسلہ شروع ہوگیا۔ پھر بھی مولانا دریابادی نے اس ہنگامہ سے جو ان کے خلاف امید کھڑا ہوگیا تھا کوئی اثر نہیں لیا اور اسی شائع شدہ مقدمہ کے ساتھ مکاتیب کی پہلی جلد شائع کردی۔ اس مقدمہ میں انھوں نے اپنے حواشی کا بھی ذکر کیا تھا، اس سے میں نے قیاس کیا کہ وہ بھلا رسمی حواشی کیا ہوں گے۔ ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' جیسی ان کی مقبول ترین کتابوں کی طرح سید صاحب اور ان کے پچاس سالہ تعلقات کی ایک دلچسپ تاریخ ہوگی جس کی طرف میں سید الملت کے عنوان سے ''صدق جدید'' میں اور حیات سلیمان کے عنوان سے ''فاران'' کراچی مئی ۱۹۵۷ء میں اشارہ کرچکا تھا، لیکن یہ جلد تبصرہ کے لئے یہاں آئی تو سید صاحب کے خطوط سے پہلے میں نے ان کے حواشی نہایت بے تابی کے ساتھ پڑھنے شروع کردیئے تو ان میں کہیں بھی ان دونوں ہم عصر بزرگوں کے پچاس سالہ تعلقات کی داستان تو درکنار جس کا میں مدت سے متوقع اور آرزومند تھا، اس کی طرف اشارہ تک نہیں تھا جس سے مجھ کو سخت مایوسی ہوئی۔

اس کے بعد سید صاحب کے خطوط پڑھنے شروع کئے تو ان میں وہ خطوط بھی نظر آئے جو انتہائی راز کے تھے تو باوجود سید صاحب کے قلم کے ایک ایک حرف سے والہانہ شغف رکھنے کے اور ان کے شائع کرنے کے شوق کے بے اختیار میری زبان سے نکل گیا کہ کاش یہ رازدارانہ خطوط شائع نہ ہوتے اور اگر شائع بھی ہوگئے تو راز کی باتوں کو پہلے قلم زد کردیا جاتا تا کہ اوروں کو اس کا علم نہ ہوتا، مگر انھوں نے میرے خیال میں دو باتوں کے پیش نظر ان کو شائع کردیا، ایک یہ کہ سید صاحب کے مختلف دورہائے حیات کے جذبات واحساسات کی پوری تصویر لوگوں کے سامنے آجائے۔ دوسری یہ کہ سید صاحب اور ان کے جو شدید تعلقات باہم تھے اور ایک دوسرے پر جو غیر معمولی اعتماد تھا اس کا علم دارالمصنفین اور ندوہ کے باہر کے لوگوں کو بھی ہوجائے۔ اس میں خدانخواستہ کسی بدنیتی کو دخل نہ تھا مگر ان رازدارانہ خطوں کی اشاعت سے موجودہ ذمہ داران دارالمصنفین کو سخت اختلاف ہوگیا۔ یہاں تک کہ مولانا دریابادی دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کی صدارت اور مجلس انتظامیہ کی رکنیت

سے استعفیٰ تک دینے کے لئے تیار ہو گئے اور شاید انھوں نے اپنا استعفیٰ بھیج بھی دیا جس کی اطلاع موصوف سے غایت تعلق کی بنا پر مجھ ناچیز کو بھی دی جس میں یہ شعر لکھا تھا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

وہ تو مولانا عمران خاں ندوی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی درمیان میں پڑے اور معاملہ رفت گذشت ہو گیا اور تعلقات رفتہ رفتہ پھر استوار ہو گئے اور مولانا حسب معمول ان مجلسوں میں شرکت کے لئے اپنی زندگی کے اخیر تک دارالمصنفین آتے رہے اور اپنی میزبانی کا شرف ان حضرات کو بخشتے رہے لیکن پہلے ایسا خلوص باقی نہیں رہا یہاں تک کہ اپنی زندگی کی آخری کتاب ''معاصرین'' میں اپنے تمام معاصرین میں یہاں کے لوگوں کو شامل نہیں کیا جن سے بڑھ کر ان کا اور کوئی معاصر نہیں تھا۔ اس کمی کو ان حضرات نے بھی محسوس کیا ہوگا۔ وہ دنیا سے کم از کم شاہ صاحب سے خوش نہیں گئے۔ وہ اپنی اور کتابوں کے ساتھ ''مکاتیب سلیمانی'' کی دونوں جلدوں کی ایجنسی بھی دارالمصنفین میں قائم کرنا چاہتے تھے جس کے لئے یہاں کے لوگ راضی نہیں ہوئے۔ پھر بھی ان کی اشاعت میں فرق نہیں آیا۔ شائقین برابر ''صدق جدید'' کے مکتبہ سے منگواتے اور خریدتے رہے۔ اخبارات ورسائل نے بھی ان پر تبصرے لکھے۔ آخر کیوں نہیں لکھتے کہ یہ سب تو سید صاحب علیہ الرحمہ کے قلم ہی سے تھا۔ جنھوں نے ''سیرت عائشہؓ، ارض القرآن، خطبات مدراس، رحمت عالم اور سیرت النبی کی چار ضخیم جلدیں لکھی تھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اُسی زمانہ میں ''حیاتِ سلیمان'' بھی زیر تالیف تھی، فاضل مؤلف نے مکتوبات سلیمانی کی ان جلدوں سے بھی فائدہ اٹھایا جن کا حوالہ کتاب میں موجود ہے۔

☆☆☆

مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک حیدر آبادی مسترشد

جناب غلام محمد صاحب کا خط میرے نام

مکرمی زید لطفکم !

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کرم نامہ مجلس علمی میں پڑا رہا عرصہ سے جانا نہ ہوا تھا۔ پرسوں جب گیا تو محبت نامہ پاکر مسرت بھی ہوئی اور اتنی دیر سے ملنے کا افسوس بھی ہوا۔

آپ کا اسم گرامی سنا تھا غالباً سلمان میاں سے یا اسی خانوادہ کے کسی اور فرد سے۔ شکریہ کہ آپ نے مراسلت کا موقعہ بھی فراہم کردیا۔

یہاں میرے بے تکلف واقف ناشروں میں صرف ایک اقبال سلیم گاہندری ہیں مگر وہ چھوٹی کتابیں سرے سے چھاپتے ہی نہیں۔ رہی ہماری مجلس علمی تو اس کے دائرہ عمل سے بھی اس نوعیت کی کتابیں خارج ہیں خود ''تذکرہ سلیمان'' کا وہاں سے چھپ جانا بجز کرامت سلیمانی کے کچھ نہیں کہ خود مالک مجلس علمی محمد ابن موسیٰ مرحوم نے بہ اصرار اس کو مجھ سے لیا اور مجلس علمی سے چھپنے کی تاکید کردی، ورنہ مجلس علمی سے نوادر یا پھر ٹھیٹ علمی کتابیں وہ بھی زیادہ تر عربی چھپتی ہیں۔

البتہ لاہور کے مکتبہ جدید سے اگر راست ہی بات چیت کرلیں تو وہ شاید اس کام پر آمادہ ہوجائیں، کیوں کہ وہ ہلکی پھلکی کتابیں زیادہ شائع کرتے ہیں۔

''مکتوبات سلیمانی'' کی بابت یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ خود دارالمصنفین والے بھی اس کے چھپنے کے مخالف تھے مگر مولانا دریابادی تو مخالفت سے اور زیادہ کمربستہ ہوجاتے ہیں اور وہی ہوا الخیر فی ماوقع۔

خاک پائے سلیمان

غلام محمد غفرلہ کراچی

''معاصرین''

مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی سے متعلق میرا خط

امید ہے کہ آپ بالکل اچھے اور تندرست ہوں گے فالج کے اثرات سے نجات پا گئے ہوں گے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کو اس دوسرے حملہ سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

آپ کی نئی زیر ترتیب کتاب ''معاصرین'' کی بشارت ''صدق جدید'' سے ملی تھی اور اردو کے موجودہ ادبی خزانہ میں اس قیمتی اضافہ سے پورے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور خیال تھا کہ کاغذ، کتابت اور طباعت کی جب بھی سہولت میسر آئے گی قدردانوں تک مکمل ہو کر پہنچ جائے گی اور دعا کرتا تھا کہ وہ سہولت جلد سے جلد نصیب ہو اور جس قدر جلد ممکن ہو منظر عام پر آجائے۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ چھپنے سے پہلے ''صدق جدید'' کے اوراق کی بھی قسط وار زینت بنے گی۔ ابھی تک اس کی دو قسطیں آئی ہیں جس کا آغاز جناب والا کے قابل صد احترام والدین سے ہوا ہے، ان کے پڑھنے میں مجھے جو لذت ملی اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صدق کا انتظار مجھے یوں بھی بہت بے چینی سے رہا کرتا ہے اور اس سلسلے کے جاری ہو جانے سے اس میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس میں خردوں اور بزرگوں میں سے جن خوش قسمت لوگوں کا نام آیا ہے ان کی فہرست آپ نے پہلے ہی دے دی ہے۔ ان میں آپ کے سب سے زیادہ بے تکلف دوست، مخلص دوست، قابل اعتماد دوست، رازدار دوست، ہم فکر و ہم خیال دوست، سید الملت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں جن کو ساری عمر آپ کی دوستی پر فخر رہا۔ جب وہ وفد خلافت کے رکن ہو کر ایک زمانہ میں یورپ تشریف لے گئے تھے تو دارالمصنفین کا نگراں اور ''معارف'' کا قائم مقام اڈیٹر

آپ ہی کو بنا کر گئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں آپ ہی ''معارف'' ایڈٹ کرتے اور شذرات لکھتے تھے۔ یورپ کے جن جن ملکوں میں گئے وہاں سے آپ ہی کو سب سے زیادہ خطوط لکھتے رہے، وہ جتنا آپ کے سامنے کھلے کسی کے سامنے نہیں کھلے۔ جس کا اندازہ اس مجموعہ خطوط سے ہوتا ہے جو ''مکتوبات سلیمانی'' کے نام سے دو جلدوں میں آپ نے شائع فرمایا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ آپ کے ساتھ سید صاحب کے اخلاص، محبت واخوت ومودت کا آئینہ دار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سلسلہ میں جب ان کا نمبر آئے گا تو ان پر اظہار خیال اور معاصروں کے مقابلہ میں انشاء اللہ سب سے زیادہ ہوگا۔ کہ معاصر صحیح معنی میں آپ کے وہی تھے اور وہ بجاطور پر مستحق تھے کہ ان پر بھی ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ڈائری'' کی طرح کتاب لکھی جائے۔ جس کا اصرار مجھے ان کتابوں اور معارف کے سلیمان نمبر کے شائع ہونے کے بعد ہی سے ہے، لیکن میری آرزو نہ تو ''مکتوبات سلیمانی'' کے گرانقدر حواشی وتعلیقات سے پوری ہوئی نہ آئندہ ان پر ویسی ہی کسی مبسوط کتاب کی تصنیف کی توقع کر سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنی زیر ترتیب نئی کتاب ''معاصرین'' میں اس کی تلافی ضرور فرمادیں گے تاکہ ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے لے کر دم واپسیں تک آپ دونوں بزرگوں کے غیر معمولی تعلقات کا پورا مرقع سامنے آجائے۔ ''حیاتِ سلیمان'' کے شائع ہونے کے بعد اس کی ضرورت اور زیادہ محسوس ہونے لگی ہے، جس میں سید صاحب کے معاصرین سے تعلقات وروابط کا ذکر جمال کے ساتھ آیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ جیسے بزرگ کے تعلقات کا ذکر بھی اختصار ہی کے ساتھ ہے، کاش کہ ''مکتوباتِ سلیمانی'' کی دونوں جلدوں کی روشنی میں اور ذاتی واقفیت اور اس سے بڑھ کر دارالمصنفین کے مجلس عاملہ کے رکن اور پھر مستقل صدر کی حیثیت سے اور دارالمصنفین سے شروع ہی سے گوناگوں تعلق اور غیر معمولی دلچسپی اور شفقت کی بنا پر کچھ زیادہ تفصیل سے آتا۔ اب اس کی کمی اپنی اس کتاب میں پوری کر سکتے ہیں۔ آپ کے پیر ومرشد مولانا تھانوی پر دو قسطیں آئی ہیں جن پر پہلے ہی سے حکیم الامت کے نام سے آپ کی ایک ضخیم کتاب موجود ہے جس سے ان کی ذات اقدس کے ساتھ آپ کے والہانہ تعلق پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

معلوم نہیں آپ نے اپنے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب ڈپٹی کلکٹر کو اس میں جگہ دی ہے

یا نہیں۔ والدین کے بعد تو انہی کا نمبر آنا چاہئے تھا کہ بہت زمانہ تک ان کے ساتھ آپ کی معاصرت رہی ہے بلکہ خانقاہ تھانہ بھون تک پہنچنے میں ان کی رہنمائی کو بھی اچھا خاصا دخل رہا ہے۔ وہ آپ کے شفیق بھائی بھی تھے اور سمدھی بھی۔ آپ کی چاروں صاحبزادیاں انھیں کے چاروں لائق صاحبزادے سے منسوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کی عمریں دراز فرمائے اور ان سب سے دنیا میں آپ کی نسل جاری فرمائے۔

شاہ معین الدین صاحب کا جس دن انتقال ہوا ہے اس دن صبح کو حسب معمول نشست میں میں نے خاص طور سے آپ کی اور مولانا عبدالباری ندوی کی خیریت دریافت کی تھی۔ آپ کے متعلق انھوں نے فرمایا تھا کہ اب کی مرتبہ تو میں ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے دریاباد نہیں جاسکا لیکن سماعت اور بصارت دونوں سے محروم ہوتے جارہے ہیں اور مولانا عبدالباری تو مضغۂ گوشت ہر کررہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو اور ہر طرح ان کے ساتھ رحم کا معاملہ فرمائے۔ جس کے وہ اپنے طویل خدمات اور دینی زندگی کے اعتبار سے اول روز سے مستحق ہیں، جب تک ان کا تعلق دارالمصنفین سے رہا، مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے اور ہمنامی کی وجہ سے سمی کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور پذیرائی فرماتے تھے۔

خدا آپ کا سایہ شفقت ابھی دیر تک ملک وملت پر قائم رکھے اور آپ کے فیوض وبرکات کا سلسلہ برابر جاری رہے اور "تفسیر ماجدی" نظر ثانی ہو کر آپ کی زندگی ہی میں پوری کی پوری منظر عام پر آجائے۔ اسی طرح انگریزی تفسیر ماجدی بھی مکمل ہو جائے۔ آپ کے یہ دونوں کام آپ کی مغفرت اور بخشش کا ذریعہ ہیں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ وقت کے ایک ممتاز فلسفی اردو کے صاحب طرز انشا پرداز کی زندگی کا انجام قرآن اردو انگریزی تفسیر وترجمہ کی خدمت پر ہوگا۔ یہ آپ کی زندگی کی کتنی بڑی اور کتنی قابل رشک سعادت ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست ☆ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

("صدق جدید" لکھنؤ میں ۲۸ رفروری ۱۹۷۵ء کو شائع ہوا)

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف

''معاصرین'' میری نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کے مکاتیب کے شائع کرنے کا مژدہ سنایا تھا تو یہ بھی خوش خبری دی تھی کہ اس میں کہیں کہیں تشریحی حواشی بھی ہوں گے۔ اس کو سن کر میں بہت خوش ہوا تھا کہ میں نے ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کی طرح سید صاحب اور ان کے پچاس سالہ تعلقات، اخلاص ومحبت کی تاریخ لکھنے کی ایک زمانہ میں ان سے جو فرمائش کی تھی وہ ان حواشی سے پوری ہو جائے گی لیکن جب بڑے صبر آزما، انتظار کے بعد مکاتیب کا پہلا مجموعہ ان کے ''صدق'' میں شائع شدہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا اور حواشی دیکھے تو اپنی توقع کے پوری نہ ہونے کا بے حد غم ہوا۔ مگر اب جب کہ مولانا نے اپنے تمام ضروری علمی کاموں سے تقریباً فارغ ہو کر جن میں ایک تفسیر ماجدی اردو پر نظر ثانی بھی تھی اور جس کی دو جلدیں ان کے مزید اضافوں کے ساتھ اسی ہندوستان میں مختلف مطابع سے چھپ کر قدر دانوں تک پہنچ بھی گئی ہیں۔ اپنے خورد وکلاں معاصرین کے سوانحی خاکہ کے شائع کرنے کا مژدہ سنایا ہے تو ہمیں امید ہے کہ اس میں سید صاحب کا سوانحی خاکہ سب سے طویل ہوگا۔ اس میں ان دونوں بزرگوں کے تعلقات، مہر ومحبت کی پوری داستان تو ضرور آجائے گی جس کے سننے کے لئے خاکسار کے جیسے کتنے لوگ مشتاق وآرزو مند ہوں گے۔ حیات سلیمان کے بعد جس میں سید صاحب کے معاصرین کا تذکرہ بہت ہی اجمال کے ساتھ آیا ہے، ان دونوں بزرگوں کی داستان مہر ومحبت سننے کی طلب اور تمنا اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کی فہرست میں مولانا اشرف علی تھانوی بھی ہیں اور مولانا محمد علی جوہر

بھی جن پر ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کے نام سے مستقل کتابیں انہی کے قلم سے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ معاصرین میں سید صاحب اور ان کے پچاس سالہ تعلقات کی تاریخ کا کوئی گوشہ بھی انشاء اللہ تشنہ نہ رہے گا اور خوب دل کھول کر لکھیں گے تا کہ مکاتیب کے مجمل ترین حواشی وتعلیقات کی پوری تلافی ہو جائے، مگر مولانا کے لفظ خاکہ سے ڈر لگتا ہے کہ خدانخواستہ کہیں اس سے بھی ہماری مدت کی توقع پوری نہ ہو۔

سید صاحب کی زندگی کا ایک اہم واقعہ پاکستان میں مخمورانہ قیام ہے جس نے ان کی زندگی کا سارا اطمینان وسکون درہم برہم کردیا تھا اور وہ اس کے بعد اپنے شایانِ شان کوئی وقیع علمی خدمت نہ کرسکے۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو مولانا سے بڑھ کر کوئی دوسرا پوری نہیں کرسکتا کہ ان کے اور سید صاحب کے مابین بلکہ نفس واپسیں تک خط وکتابت کا سلسلہ قائم تھا، بلکہ اپنی زندگی کا آخری خط انہی کو لکھا تھا۔

یہ خط وہ اپنے صاحب زادہ سید سلمان سلمہ کو املا کرا رہے تھے کہ ان پر ضعف غالب آ گیا اور وہ ناتمام رہ گیا۔ سید سلمان نے سید صاحب کی وفات کے بعد یہی ناتمام خط مولانا کے پاس بھیج دیا اور مولانا نے جوں کا توں ''مکاتیب سلیمانی'' کی دوسری جلد میں شائع کردیا۔ یہ خط بہت ہی رقت انگیز ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحب کو بادلِ ناخواستہ دارالمصنفین چھوڑنے کا کتنا غم تھا، اس کو انھوں نے بڑے ولولہ سے قائم کیا تھا اور اس کے فروغ وترقی کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کردیا تھا۔ مگر مقدر یہی تھا جو پیش آیا، جس کا سید صاحب کو کبھی وہم بھی نہ ہوا ہوگا، لیکن اس میں کسی کا کیا چارہ تھا۔ مشیت ایزدی یہی تھی جو ہوا ان کی عمر گرانمایہ دارالمصنفین کی خدمت ہی میں گزرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان کا مدفن بھی مولانا شبلی اور ان کے تلامذہ کی طرح دارالمصنفین ہی میں ہوتا۔ جس کی ان کو بڑی آرزو بھی تھی، جب تک وہ زندہ رہے ان کو اعظم گڑھ کی یاد ستاتی رہی اور وہ آنے کے لئے تڑپتے رہے۔

اس سوانحی خاکہ میں خردوں میں جن کا نام آیا ہے ان میں ایک مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم بھی ہیں۔ ان سے میر امدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں استادی وشاگردی کا تعلق رہا

ہے۔سید صاحب نے ان کی جواں مرگی پر ''ندوہ کے لعل شب چراغ'' کے عنوان سے معارف میں ان کا بڑا دلدوز ماتم لکھا تھا۔مولانا شبلی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بڑے بڑے جلسوں میں ان کو اپنے ساتھ لیوا جاتے تھے۔ان سے تقریر کراتے تھے۔سرائے میر کے جلسہ میں بھی ان کو ایک مرتبہ لائے تھے اور اس کم عمری میں ان کی پرزور اور عالمانہ تقریر سن کر مجمع بہت متاثر ہوا تھا اور اس کی یاد ایک عرصہ تک قائم رہی۔اگر ان کی عمر نے وفا کی ہوتی تو خطابت میں وہ دوسرے مولانا ابوالکلام ہوتے۔تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات میں ان کی شعلہ بار تقریروں نے ہمارے ضلع میں بڑی ہلچل پیدا کردی تھی۔مولانا ان پر لکھیں گے تو خوب لکھیں گے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کو علم وادب اور دین وملت کی خدمت کے لئے صحت وتوانائی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ عمر عطا فرمائے۔ ع: ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

ضیاء الحسن علویؒ

''حیاتِ سلیمان میں فاضل مصنف نے احباب خاص میں جن احباب کا شمار کیا ہے ان میں سرفہرست مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی ہیں جو سید صاحب کے طالب علمی کے زمانہ کے ساتھی اور تعلیم میں ان سے ایک درجہ آگے تھے اور مولانا شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔سید صاحب کی طرح مولانا ان کو بھی بہت مانتے تھے، اگرچہ ان کی راہ انگریزی تعلیم کے حصول کے بعد مختلف ہوگئی تھی، اور وہ صوبہ متحدہ کے عربی وفارسی کے امتحانات کے رجسٹرار اور مدارسِ عربیہ کے انسپکٹر ہوگئے تھے تاہم دونوں بزرگوں کے تعلقات برابر قائم رہے، لیکن وہ اس میں جا کر ایسا کھو گئے کہ بہت کم لوگ ان کو ندوہ کے ایک ممتاز فاضل کی حیثیت سے جان سکے۔ان کی کوئی علمی یادگار بھی نہیں ہے۔اسی ملازمت کے زمانہ میں ۱۹۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور سید صاحب اپنی زندگی میں اپنے ایک بے تکلف دوست اور ساتھی سے محروم ہوگئے۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی

ضیاء الحسن علوی کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا نام نامی ہے۔ان کے اور سید صاحب کی طالب علمی کا زمانہ ایک ہی تھا۔ وہ ابھی کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھ رہے تھے کہ سید صاحب ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ دونوں کی ملاقات یہیں لکھنؤ میں مولانا شبلی کی بزم کمال میں ہوئی۔ مولانا دریابادی مولانا شبلی کے باقاعدہ شاگرد تو نہیں تھے لیکن ان کی علمی صحبتوں میں برابر شریک ہوتے تھے اوران سے استفادہ کرتے تھے۔ مولانا شبلی نے سیرت نبوی کا جو دفتر قائم کیا تھا اس میں کچھ دنوں سیرت پر مستشرقین یورپ کی کتابوں کے ترجمہ اور خلاصہ کا کام کیا تھا۔ سید صاحب کا بھی اس دفتر سے تعلق تھا۔اس طرح رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں میں بڑی قربت اور یگانگت ہو گئی تھی،مولانا شبلی کی ۱۹۱۴ء میں وفات کے بعد ان ہی کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق سید صاحب نے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین قائم کیا۔اس کی مجلس انتظامیہ کا ان کو بھی رکن بنایا۔اس وقت سے اب تک دارالمصنفین سے ان کا تعلق قائم ہے اور وہ اس وقت اس کی مجلس عاملہ کے صدر ہیں۔ مولانا ضیاء الحسن علوی کی طرح یہ بھی سید صاحب کے بہت بے تکلف دوست تھے۔ان سے کوئی پردہ نہیں تھا جیسا کہ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے جو ''مکاتیب سلیمانی'' کے نام سے مولانا نے دو جلدوں میں شائع کئے ہیں۔ مکتوبات کی یہ دونوں جلدیں ان کے باہمی خلوص و محبت اور اعتماد کی آئینہ دار ہیں۔ سید صاحب وفد خلافت کے ساتھ یورپ گئے تھے تو دارالمصنفین کے علمی شعبہ کی نگرانی اور ''معارف'' کی ادارت انہیں کے سپرد کر گئے تھے اور وہی ان کی عدم موجودگی میں ''معارف'' کے قائم مقام اڈیٹر کی حیثیت سے اس کو مرتب کرتے تھے اور شذرات لکھتے تھے۔ علمی خبریں جمع کرتے تھے۔''برید فرنگ'' کے نام سے سید صاحب کے سفر یورپ کے زمانہ کے خطوط کا

مجموعہ مکتبہ الشرق کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں زیادہ تر خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی ہی کے نام ہیں۔ ''حیات سلیمان'' کی تالیف میں ان خطوط کے مجموعہ سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

ہمیں پوری امید ہے کہ مولانا اپنے سوانحی خاکہ میں حیات سلیمان کے اجمال کی پوری تفصیل فرمائیں گے۔ ('' کانفرنس گزٹ'' کے شمارہ یکم جولائی ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا)

''مکتوبات سلیمانی'' میری نظر میں

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے نام کے مولانا سید سلیمان ندوی کے خطوط کی اشاعت اور ان خطوط پر اپنے حواشی وتعلیقات اور تشریحات کا مژدہ سنایا تو میں فرط مسرت سے اُچھل پڑا کہ اِن حواشی وتعلیقات سے سید صاحب اور ماجد صاحب کے پچاس سالہ تعلیقات کی تاریخ کی انشاء اللہ تلافی ہو جائے گی جس کے مرتب ہونے کا میں مدت سے آرزومند اور متمنی تھا۔ مکاتیب کی پہلی جلد بصد ہزار تمنا اور آرزو میرے ہاتھوں میں آئی تو سید صاحب کے اصل خطوط سے پہلے میں نے انھی کے حواشی وتعلیقات وتوضیحات کا نہایت بے تابی سے جائزہ لینا شروع کر دیا تو ان میں حسب توقع ان دونوں معاصر بزرگوں کے تعلقات کی داستان کیا اس کی طرف اشارہ تک نہ تھا۔ جس سے مجھ کو قدرتی طور پر بڑی مایوسی ہوئی۔ کہ اگر اب انھوں نے نہیں لکھا تو کب لکھیں گے۔ بلاشبہ ان خطوط کی روشنی میں ان دونوں صاحبوں کے تعلقات کی تاریخ ضرور مرتب کی جاسکتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہ مکتوب الیہ کے قلم سے نہ ہوگی تو پھر اس کو کون پڑھے گا اور اب تو ان کی وفات کے بعد یہ امید ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کی طرح سید صاحب جیسے معاصر سے نہایت مخلصانہ، محبانہ، قدردانہ، تعلقات وروابط کی تاریخ لکھنے کے لئے وہ اپنی زندگی کے آخر تک کیوں نہیں آمادہ ہوئے۔ جب کہ میں نہایت خلوص کے ساتھ اپنی تحریروں کے ذریعہ ان کو متوجہ بھی کرتا رہا، اگر انھوں نے لکھی ہوتی وہ بھی ''حکیم الامت'' اور ''محمد علی ذاتی ڈائری'' کی طرح کم دلچسپ نہ ہوتی اور لوگ اس کو خوب ذوق وشوق سے

پڑھتے اور لطف اندوز ہوتے۔

سید صاحب کے ان عالمانہ خطوط کے پڑھنے میں بھی مجھے وہی لذت ملی جو سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی کے نام کے ذخیرہ خطوط کے نقل کرنے میں ملی تھی۔ ان میں وہ خطوط بھی ہیں جو سید صاحب نے انتہائی بے تکلفی میں ان کو لکھے تھے یا بہت راز کے تھے، یا انہی کی ذات تک کے لئے تھے۔ میرے خیال میں دو وجہوں سے ان کو بھی شائع کردیا۔ ایک تو یہ کہ سید صاحب کے ہر دورِ حیات کے جذبات واحساسات وخیالات کی ہو بہو تصویر سامنے آجائے کہ ہر عمر میں کسی کے بھی یکساں جذبات وخیالات نہیں رہتے ہیں۔ حالات کے تحت بدلتے رہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کے اور سید صاحب کے درمیان جو عمیق اور گہرے تعلقات تھے ندوہ اور دارالمصنفین کے حلقہ کے باہر کے اہل نسبت ان سے واقف ہو جائیں۔

جب میں نے مکاتیب کی پہلی جلد کے شائع ہونے کا مژدہ خط کے ذریعہ مولانا سید نجیب اشرف صاحب دیسنوی کو سنایا اور یہ بھی لکھا کہ آپ لوگوں کی توجہ سے ارباب دیسنہ کے نام کے خطوط کا مجموعہ شائع ہو جاتا تو اولیت کا شرف اسی کو حاصل ہو جاتا مگر یہ شرف مولانا مسعود عالم ندوی نے حاصل کرلیا کہ انھوں نے اپنے نام کے سارے خطوط کتابی شکل میں سب سے پہلے شائع کردیے۔ ان سے شاگرد اور استاد کے تعلقات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے تو انہی کے نقش قدم پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے نام کے خطوط کو کتابی شکل میں جمع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے تو ہم سب کے لئے کتنی خوشی کی بات ہے مگر انھوں نے میرے عریضہ کا نہ تو جواب دیا اور نہ دیسنہ کے اعزا و اقارب واحباب کے نام کے خطوط کی اشاعت سے کسی دلچسپی اور شغف کا اظہار فرمایا جو میرے لئے بہت تعجب انگیز بات تھی، حالانکہ ان کو اپنے نام کے خطوط جمع کرنے کا دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ ہی سے شوق تھا بلکہ خطوط کا ایک بھرا ہوا بکس یہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے جو بعد میں سب کے سب ضائع ہوگئے۔ سید صاحب نے خود ان کو بھی اپنی پوری زندگی میں معلوم نہیں کتنے خطوط لکھے ہوں گے جن کو انھوں نے محفوظ بھی رکھا ہوگا، مگر معلوم نہیں کیوں ان کی اشاعت کو ضروری نہیں سمجھا۔ سید صاحب ان سے بڑا تعلق رکھتے تھے، ان کی علمی صلاحیتوں کے

بڑے قدرداں تھے۔ ان کو دارالمصنفین کی رفاقت میں لائے۔ ان کے چھوٹے بھائی سید نواب اشرف صاحب سے اپنی لڑکی سیدہ کی شادی بھی کی۔ جو سید صاحب کی پہلی بیوی کے بطن سے تھیں اور سید ابو سہیل کی سگی بہن تھیں۔ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں ان کو ندوہ بھی عربی تعلیم کے لئے لیوا گئے تھے، لیکن ان کا رجحان انگریزی تعلیم کی طرف تھا۔ اس لئے وہ فوراً وہاں سے واپس چلے گئے اور اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل میں لگ گئے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی یا تاریخ میں ایم اے میں گولڈ مڈلسٹ ہوکر فارغ ہوئے، لیکن ندوہ سے اتنی ہی نسبت سے وہ اپنے کو ندوی لکھتے تھے اور ندوہ کے فضلاء سے بھی ان کے علمی وادبی کارناموں کی بنا پر جو انھوں نے سید صاحب کی نگرانی میں دارالمصنفین میں انجام دیے، نہایت فخر کے ساتھ ان کو اپنی برادری میں شامل کرلیا۔ ان کی ذات پر ندوہ کو اسی طرح فخر ہے جس طرح اور دوسرے صاحب قلم اور صاحب تصنیف فضلا پر ہے۔

جہاں تک مولانا عبدالماجد اور سید صاحب کی علمی وادبی حیثیت اور ہر دور میں ان دو کی اردو زبان کی وسیع خدمات کا تعلق ہے۔ ان خطوط کی اشاعت کو بہت پسند کیا گیا خصوصاً سید صاحب کے دو پاکستانی شاگردوں مولوی غلام محمد صاحب بی اے صاحب ''تذکرۂ سلیمان'' اور پروفیسر اشرف خاں صاحب پشاور یونیورسٹی نے بہت پسند کیا اور ''صدق جدید'' میں ان پر اپنے قلم سے الگ الگ تبصرے لکھے اور ان کے شائع کرنے پر مولانا کو خراج تحسین پیش کیا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی رسالہ ''برہان'' دہلی میں بہت حوصلہ افزا ریویو لکھا اور سید صاحب کی خطوط نگاری کی خصوصیات دکھائیں۔ نجیب اشرف صاحب کی وفات کے بعد اہل دیسنہ کے نام کے خطوط کی اشاعت کی توقع اب سید شہاب الدین صاحب دیسنوی سے ہے جو ماشاء اللہ بہت اچھے اردو کے اہل قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور اردو کی اشاعت کے بہت بڑے مبلغ اور مناد ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میری اس خواہش سے ان کو کہاں تک دلچسپی ہوسکتی ہے۔

شاہ معین الدین صاحب نے ''حیات سلیمان'' کی تالیف میں ''برید فرنگ'' سے جس کے بیشتر خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی ہی کے نام ہیں اور مکتوبات سلیمانی کی دونوں جلدوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ''برید فرنگ'' کے تو قریب قریب سارے خطوط انھوں نے نقل کردیے ہیں جو

یورپ کے مختلف ملکوں اور شہروں یعنی انگلینڈ، فرانس، اٹلی، ویانا، پیرس، روما وغیرہ کے سفر کے حالات وواقعات ومشاہدات وتاثرات پر مشتمل ہیں۔ مکاتیب سلیمانی کے حوالے یوں تو اس کتاب میں جابجا آئے ہیں، لیکن اس کی دوسری جلد کا ایک پورا خط نقل کردیا ہے۔ یہ خط سید صاحب نے اپنی علالت کے زمانہ میں اپنے لائق صاحبزادہ سید سلیمان ایم اے لکچرر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد کو املا کرا رہے تھے کہ دفعتاً ضعف طاری ہوگیا اور سید صاحب خاموش ہوگئے۔ خط نامکمل رہ گیا اور اسی نامکمل حالت میں میاں سلمان نے مولانا کے پاس بھیج دیا اور مولانا نے جوں کا توں مکاتیب کی دوسری جلد میں شائع کردیا۔ اس خط سے سید صاحب کے سفر پاکستان پر بھی بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ جس کو سید صاحب کے دشمنوں، بدخواہوں اور حیات اللہ انصاری اڈیٹر روزنامہ ''قومی آواز'' لکھنؤ جیسے نیشنلسٹوں نے ایک افسانہ بنادیا ہے اور ہندوستان میں سید صاحب کے خلاف فضا پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپی حیات اللہ انصاری نے لی اور سید صاحب کی مخالفت میں روزنامہ قومی آواز میں کئی اداریئے لکھے اور ان کو بھی اپنے سوءِ ظن کی بنا پر چودھری خلیق الزماں صاحب وغیرہ کی صف میں شامل کردیا اور اس کے متعلق سید صاحب سے جو اس سفر کے کئی برس بعد تک زندہ رہے دریافت حال کی ضرورت نہیں سمجھی۔ یہ سید صاحب پر کتنا بڑا ظلم تھا۔

سید صاحب تو درحقیقت اپنی ایک بیمار بچی اور ایک بیمار نواسی کی عیادت کے لئے پاکستان تشریف لے گئے تھے اور جب جب وہاں سے واپسی کا ارادہ فرماتے تھے۔ انڈین ہائی کمشنر متعینہ کراچی کا دفتر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا کردیتا تھا بالآخران کو ہندوستان واپس آنے کی ہزار کوشش وسعی اور دوڑ دھوپ کے باوجود اجازت نہیں ملی اور ان کو بادل ناخواستہ طرح اقامت وہیں ڈال دینی پڑی، لیکن جب تک زندہ رہے اپنے وطن دیسنہ اور اعظم گڑھ کے لئے جہاں زندگی کا بڑا حصہ گذارا تھا۔ برابر تڑپتے رہے۔ اس خط سے ان کے بدخواہوں اور بدسگالوں کی غلط فہمیاں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ دور ہوئیں کہ نہیں۔ اس سے بڑھ کر سید صاحب اپنی صفائی کی اور کیا صورت پیش کرسکتے تھے۔

اس میں ان دونوں مجموعہائے خطوط کے بعد سید عبدالحکیم صاحب دیسنوی کے نام کے

مجموعہ خطوط سے بھی جو مخطوطہ کی شکل میں دارالمصنفین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ فائدہ اٹھایا گیا ہے اور وہ ناگزیر بھی تھا کہ سید صاحب اپنے وطن کے دوستوں میں سب سے زیادہ انہی سے تعلق رکھتے تھے اور جہاں بھی رہے انہی کو اپنے حالات لکھ لکھ کر بھیجتے رہے۔ ان کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ اس کتاب میں ان کے نام کا ایک پورا خط جو سید صاحب کے سفر بنگلور اور وہاں کے تاثرات اور مشاہدات سے متعلق ہے اور جو پہلے ''معارف'' میں شائع ہوا تھا نقل کر دیا ہے۔

شاہ صاحب تو اپنے نام کے قریب قریب تمام خطوط موقع موقع سے نقل کر دیئے ہیں جن سے صاحب کتاب اور صاحب سوانح کے عمیق باہمی تعلقات پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے سارے خطوط جو اعزہ، تلامذہ و احباب ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر، معاصرین اور یورپ و امریکہ کے مختلف ملکوں کے مستشرقین اور خود ہندوستان کے ہندو فضلاء و مؤرخین وغیرہ کے نام ہیں اکٹھا کر کے الگ الگ جلدوں میں پورے اہتمام کے ساتھ شائع کر دیئے جائیں۔ اس سے اردو ادب کی صنف خطوط نگاری کے ذخیرہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہو جائے گا۔

مولانا شبلی کی طرح سید صاحب کی شخصیت بھی بڑی ہمہ گیر ہو گئی تھی۔ علی گڑھ نے بھی ان کو نوازا اور ۳۷ برس کی عمر میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈی لیٹ کی ڈگری عطا کی۔ اس طرح سے اس نے اپنی مردم شناسی کا ثبوت دیا۔ سید صاحب جب تک ہندوستان میں رہے اس کی کورٹ کے مستقل ممبر رہے اور کورٹ کی میٹنگوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے رہے اور اپنے تاثرات ''معارف'' کے شذرات میں پیش کرتے رہے۔ علی گڑھ بھی ان کو ویسا ہی عزیز تھا جیسا لکھنؤ۔

انھوں نے مولانا شبلی کی یادگار میں دارالمصنفین قائم کیا اور اپنی زندگی ہی میں اس کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ یہ ان کی زندگی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جس پر ان کو جتنا بھی فخر رہا ہو کم ہے۔ وہ اور کچھ نہ کرتے تو تنہا یہی کارنامہ بقائے دوام کی مجلس میں ان کو جگہ دینے کے لئے کافی تھا، لیکن انھوں نے اس کے علاوہ اور بھی بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں جن میں ان کے معاصرین میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے سیرت میں اردو زبان میں اتنا گرانقدر لٹریچر جمع کر دیا ہے کہ عربی جیسی

وسیع زبان میں بھی اتنا وقیع مرتب لٹریچر موجود نہ ہوگا۔ انھوں نے پہلے مولانا شبلی کے دونوں نامکمل حصے مکمل کیے، پھراس کے چار حصے اور لکھے، پھر ''خطبات مدراس''، اور ''رحمت عالم'' دو اور کتابیں لکھیں۔ یہ سب کتابیں بہت مقبول ہوئی۔ ''خطبات مدراس'' پڑھ کر تو بہت سے لوگ سیرت کے خطیب، واعظ اور مقرر ہوگئے، جن میں ایک حیدرآباد کے مشہور سحر بیان خطیب نواب بہادر یار جنگ بھی تھے، وہ سیرت کے موضوع پر بھی اس کے مطالعہ کے بعد بہت اچھا بولنے لگے تھے اور خاص طور سے میلاد کی مجلسوں میں تقریر کرنے کے لئے بلائے جاتے تھے۔ انھوں نے اس کو اتنا پڑھا تھا کہ پوری کتاب حفظ ہوگئی تھی، اس کے صفحے کے صفحے ان کو زبانی یاد تھے۔ ''رحمت عالم'' سید صاحب کی سیرۃ کی چھٹوں جلدوں کا خلاصہ یا عطر ہے گویا کوزہ میں سمندر بھر دیا ہے۔ یہ بچوں اور اسکول کے طالب علموں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی تھی۔ عام فہم زبان میں اس سے بہتر اردو زبان میں شاید ہی کوئی کتاب ہو۔ یہ بہار، یوپی اور پنجاب کے اکثر مکاتب اور مدارس کے نصاب میں شامل ہے اور اب تک لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوگیا ہے۔ سید صاحب کے تتبع میں اور بھی لوگوں نے سیرت کو اپنا موضوع بنالیا ہے۔ ان میں سب سے ممتاز ڈاکٹر حمید اللہ آف پیرس ہیں۔ سیرت پر ان کی بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خود سید صاحب بھی ان کے اس ذوق کے بڑے قدرداں تھے اور ان کے مضامین بڑے فخر و انبساط کے ساتھ ''معارف'' میں شائع کرتے تھے۔ وہ ایک مرتبہ دوسری عالمی جنگ میں سید صاحب سے ملنے کے لئے دارالمصنفین بھی آئے تھے، لیکن سید صاحب اتفاق سے موجود نہ تھے اور دن بھر رہ کر اور ظہر، عصر دو وقت کی نمازیں دارالمصنفین کی مسجد میں پڑھ کر بہ حسرت وافسوس واپس چلے گئے۔ ان سے اسی موضوع پر سید صاحب کی مستقل خط وکتابت تھی۔ وہ ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں اور نہ صرف سیرت پر جو ان کا محبوب موضوع ہے اور مسائل پر بھی ان کے افاداتِ قلم کا سلسلہ بیک وقت انگریزی فرنچ اور اردو تین زبانوں میں جاری ہے۔ ان کا ایک کارنامہ فرنچ میں جو یورپ کی سب سے زیادہ وسیع زبان ہے۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی ہے۔ وہ سید صاحب کی وفات کے بعد بھی دارالمصنفین سے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین ''معارف'' میں تو اب بہت کم

چھپتے ہیں، لیکن ''معارف'' کے وہ بہت بڑے قدرداں ہیں۔ اور اس کا ایک ایک حرف بہت لطف ولذت کے ساتھ پڑھتے ہیں، کسی مضمون میں کوئی خامی یا تصحیح میں کسی فروگذاشت پر ان کی نظر پڑ جاتی ہے تو خط لکھ کر اس کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔

(صدق جدید کے شمارہ ۲۲/اپریل ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا)

حضرت شاہ معین الدین احمد ندوی کی یاد

اقتباسات میرے مضمون سے

(۱) مگر وہ محض شذرات نگاری پر قانع ہو کر رہ گئے۔ ایک مرتبہ میرے سامنے مولانا عبدالماجد دریابادی (ماجد میاں) جب ان کی میز کے پاس سے گذرے تو اس کی طرف انھوں نے خاص طور سے ان کو توجہ دلائی اور یہ بھی کہا کہ بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ شذرات کے علاوہ آپ خود بھی کچھ لکھا کیجئے۔ اس وقت وہ بہت متاثر ہوئے، لیکن یہ تاثر دیر تک قائم نہ رہا۔

(۲) شاہ صاحب کا اپنی زندگی کے اخیر تک میرے ساتھ بڑا اچھا معاملہ رہا۔ ایک مرتبہ ان کو ''مکاتیب سلیمانی'' کی اشاعت کے سلسلہ میں مجھ سے شدید اختلاف ہو گیا۔ میں ان کی اشاعت کے حق میں تھا اور وہ ان کی اشاعت سخت ناپسند کرتے تھے، میں نے اس سلسلہ میں ماجد میاں کو جو خط لکھا، انھوں نے از راہ قدردانی وذرہ نوازی ''صدق جدید'' میں شائع کر دیا، اس سے ان کو اور زیادہ اشتعال پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس معاملہ میں صباح الدین صاحب پورے طور پر ان کے ہم آہنگ نہ تھے۔ اس لئے مجھ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوسرے میرے بہت سے مخلصوں نے جن میں ان کے ایک بہت قریبی عزیز خورشید نعمانی بھی تھے اور بمبئی میں ایک کالج کے شعبۂ اردو

میں لکچرر ہیں۔ انھوں نے وہیں سے ازراہِ اخلاص شاہ صاحب سے سفارش کی، اس کے بعد رفتہ رفتہ میرے اور شاہ صاحب کے درمیان پھر ویسے ہی تعلقات ہو گئے، لیکن ان کو اپنی زندگی بھر اس کی کھٹک رہی کہ میں ماجد میاں سے زیادہ عقیدت رکھتا ہوں اور جمعہ کی نشست میں جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو مجھ پر تعریض ضرور کرتے، حالانکہ وہ ماجد میاں کے ادب وانشاء کے بڑے قدرداں تھے اور ان کو موجودہ عہد میں اردو کا سب سے بڑا انشاپرداز سمجھتے تھے اور ان کے قلم کا ایک ایک حرف بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتے۔ اس واقعہ پر اگرچہ بڑا زمانہ گذر گیا پھر بھی میں اس معاملہ میں ماجد میاں کو حق پر سمجھتا ہوں کہ ان کو اپنے نام کے سید صاحب کے تمام خطوط کے بطور یادگار شائع کرنے کا پورا حق تھا۔ عجب بات ہے کہ ان کی اشاعت سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود وہ دو جلدوں میں شائع ہوئے تو شاہ صاحب نے جہاں ''حیات سلیمان'' کی تالیف میں اور مآخذ سے فائدہ اٹھایا، ان سے بھی فائدہ اٹھایا اور ان کے حوالے جابجا کتاب میں موجود ہیں۔ دیباچہ میں اگرچہ اس کتاب کے مآخذ میں ان کو شمار نہیں کیا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کی اشاعت کس قدر ضروری تھی۔ (پندرہ روزہ ''احتساب'' علی گڑھ میں شائع ہوا۔ جس کے اڈیٹر مولانا محمد تقی امینی ساکن قصبہ صبیحہ ضلع بارہ بنکی ناظم سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مولانا عبدالماجد دریابادی کا مکتوب مجھ خاکسار کے نام

برادرم !

السلام علیکم

''کانفرنس گزٹ'' دیکھا حضرت تھانوی اور محمد علی کی تو سیر تیں یالائفیں مقصود ہی تھیں۔ ان میں ایک ماخذ خطوط بھی تھے، بخلاف مکتوبات کے وہاں تو یہی مکتوبات مقصود تھے اور اب معاصرین میں ظاہر ہے کہ سید صاحب پر بہت ہی مختصر لکھنے کا موقعہ رہ گیا ہے۔''الاحتساب'' کے مراسلہ پر اگر کوئی مواخذہ ہوا تو ظاہر ہے کہ باضابطہ طور پر میرے سامنے مسئلہ آئے گا۔ امینی صاحب پچھلے عشرہ رات بھر میرے مکان پر رہے، آج کل بیمار ہی نہیں ہوں بیمار در بیمار ہوں۔

والسلام

دعا گو

عبدالماجد

۶/جولائی ۱۹۷۵ء۔ دریاباد، بارہ بنکی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام میرا ایک خط

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا اظہار مناسب نہیں ہوتا۔ اسی طرح کا بے ساختہ اظہار میرے ایک مراسلہ شائع شدہ ''الاحتساب'' مورخہ یکم جون ۱۹۷۵ء میں ہوگیا ہے جس کا ہرگز مقصود شاہ معین الدین ندوی جیسے اردو کے کثیر التصانیف بزرگ اور اہل قلم کا خدانخواستہ استخفاف یا کسرِ شان نہیں تھا جیسا کہ میری تعبیر کی غلطی سے سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کا مقصود محض اظہار افسوس تھا

کہ سید صاحب کے دور نظامت میں شاہ صاحب کی جو قلمی اور تصنیفی سرگرمیاں تھیں، جنھوں نے ان سے سلسلہ ''سیر الصحابہ'' کے حصہ مہاجرین کی تکمیل کرائی، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک غیر مہاجر و غیر انصار صحابہ کے حالات میں ۹۶ تابعین کی سیرت لکھوائی۔ تاریخ اسلام کے عہد عباسیہ تک چار حصے لکھوائے۔ علامہ کراعلی کی کتاب ''الاسلام'' و ''الحضارۃ العربیۃ'' کا اردو ترجمہ ''اسلام اور عربی تمدن'' کے نام سے کرایا اور ''معارف'' کے لئے بہت سے تحقیقی اور ادبی مضامین لکھوائے۔ معاصر شعراء کے دواوین پر تبصرے لکھواتے رہے اور آخر زمانہ کی محض دو کتابوں اور ہر مہینہ کے ''معارف'' کے لئے چند صفحے کے شذرات لکھنے پر قانع نہ ہوجائیں بلکہ لکھا کرتے اور لکھنے کے لئے نئے نئے موضوع تلاش کرتے رہتے جس کی ترغیب سید صاحب علیہ الرحمہ خطوط کے ذریعہ پاکستان سے ان کو دیتے رہے اور یہاں مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی زبانی ان کو آمادہ کرتے رہے تو علم وادب کے ذخیرہ میں ان کے پیش روؤں کی طرح ان کے قلم سے بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا جس کی ملک وملت کو ان سے بجا طور پر توقع بھی تھی مگر ملت کی بدنصیبی سے ایسا نہ ہوسکا اور اردو زبان وادب ان کے جیتے جی ان کی خدمت سے محروم ہوگیا۔ صرف اسی حقیقت کا اس مراسلہ میں ماتم تھا۔ جس کو لوگوں نے مضمون کی اسپرٹ کے خلاف کچھ کا کچھ کردیا ہے، بھلا میں اور شاہ صاحب کا استخفاف، میں تو خواب میں بھی اس کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ میرے جذبات کا اندازہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کے شاہ معین الدین احمد نمبر کے مضمون سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ مراسلہ بالکل پیرائیویٹ تھا۔ میں نے اس کو دوبارہ پڑھے بغیر مکتوب الیہ کو بھیج دیا اور یہ بھی لکھ دیا کہ اگر آپ کے اخبار کے معیار کے لائق ہو تو شاہ صاحب کی نسبت سے شائع کردیں۔ میں لکھنے کو تو لکھ دیا لیکن میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ شائع بھی ہوسکتا ہے، لیکن ''احتساب'' کے فاضل اڈیٹر نے شاہ صاحب سے متعلق ہونے کی وجہ سے اس کے شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس میں روانی قلم میں خلاف مصلحت باتیں میرے قلم سے نادانستہ نکل گئی تھیں ان کو حذف کرکے شائع کردیا جس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

اپنے دور کے ''معارف'' کے مضمون نگاروں میں شاہ صاحب ان کو بھی بہت پسند کرتے

تھے اور ان کے مضامین بہت ذوق وشوق سے شائع کرتے تھے، وہ خود بھی شاہ صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ علم ودانش، تصنیف وتالیف کے ذوق کے ساتھ ہم وطنی کا بھی اشتراک تھا، ان کا وطن صبیحہ ردولی سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے ان کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جو کتابی شکل میں آنے سے پہلے ''معارف'' میں باقساط شائع ہو چکی ہیں اور ''معارف'' کے ناظرین کی نگاہ سے گذر چکی ہیں۔ شاہ صاحب کو ان سے اتنا شغف تھا کہ ان کے کسی مضمون کا سلسلہ ''معارف'' میں چل رہا ہوتا تو اس کی مزید قسطوں کے آنے میں دیر ہوتی تو خط لکھ کر تقاضا کرتے کہ تسلسل قائم رہے اور بیچ میں گیپ نہ ہونے پائے۔ کتابیں تو زیادہ تر ان کی حسنِ کتابت وطباعت کے ساتھ ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوئیں لیکن مضامین زیادہ تر قیام اجمیر سے لے کر قیام علی گڑھ تک ''معارف'' ہی میں شائع ہوتے رہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ ایک اچھے مضمون نگار، محقق، مجتہد، اور فن حدیث میں تبحر ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے ''معارف'' ہی نے ان کا اہل علم سے تعارف کرایا اور اب خالص دینی موضوع پر اپنی گرانقدر تصنیفات ومضامین کے ذریعہ اپنی شہرت کے نصف النہار پر ہیں۔ شاہ صاحب کو ان کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ موجودہ عہد کے ایک مصری اہل قلم فقیہ زرقاء کی ''الثوب الجدید'' کا سلیس اور عام فہم اردو میں انہی سے ترجمہ کرانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے معذرت کردی اور لکھا کہ اسی موضوع پر اسی پایہ کی کتاب تو میں لکھ سکتا ہوں لیکن کسی کتاب کا ترجمہ خواہ وہ میرے موضوع ہی سے متعلق کیوں نہ ہو ترجمہ نہیں کرسکتا، یہ بڑا کٹھن کام ہے جو مجھ کو نہیں آتا۔ پھر اس کتاب کو ندوہ کے ایک لائق مدرس اور فقیہ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی کو ترجمہ کے لئے سپرد کیا، لیکن وہ کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئے اور یہ کتاب بغیر ترجمہ کے اب تک پڑی ہوئی ہے۔

اس کتاب کو ترجمہ کے لئے شاہ صاحب نے پہلے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین کو دیا تھا اور انھوں نے اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ بھی کیا تھا اور اس کا مجھ سے مسودہ صاف بھی کرالیا تھا کہ اسی درمیان میں شاہ صاحب کو ان سے اختلاف ہوگیا، جس کے نتیجہ میں ان کو دارالمصنفین سے علاحدہ ہوجانا پڑا اور اس کا ترجمہ نامکمل رہ گیا۔

خوب یاد آیا مولانا عبدالحفیظ صاحب کے انتقال کے بعد مولوی محمد نعیم صدیقی ندوی رفیق دارالمصنفین کو یہ کتاب ترجمہ کے لئے دی گئی، وہ ترجمہ کر ہی رہے تھے کہ شاہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے ایک آدھ سال کے بعد ابوظہبی سے ملازمت کے لئے آفر آیا اور وہ یہاں کی رفاقت کو خیر باد کہہ کر ابوظہبی چلے گئے اور اس کتاب کا ترجمہ مکمل کرنے کے لئے اپنے ساتھ وہاں لے گئے۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر اس کی ایک جلد کا جیسا کہ خود ان کی زبانی معلوم ہوا تھا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ترجمہ بجائے دارالمصنفین کے ندوہ کے شعبہ نشریات سے جناب والا کے اہتمام میں شائع ہوگا۔

نوٹ: (مولانا محمد تقی امینی صاحب کو اس مراسلہ کے سلسلہ میں میرے خط سے یا کسی اور ذریعہ سے میری پریشانیوں کا علم ہوا تو ان کو مجھ سے بڑی ہمدردی پیدا ہوئی اور وہ اپنا سارا کام کاج چھوڑ کے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ سے دریاباد گئے۔ ان کو میرا ہمدرد پایا تو وہاں سے مولانا سید ابوالحسن ندوی سے اس سلسلہ میں بات چیت کرنے کے لئے لکھنؤ گئے۔)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی مجھ سے بدظن

علی میاں کا میلان تصوف کی طرف بہت زیادہ ہے۔ میں نے ''معارف سلیمان نمبر'' پر ''فاران'' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سید صاحب طبعاً صوفی نہیں تھے، نہ صوفی بنے، وہ وقت کے شاہ ولی اللہ تھے اور شاہ ہی صاحب کا علمی رنگ ان پر ان کی زندگی کے اخیر تک رہا۔ ان کے متعلق یہ بھی لکھا تھا کہ وہ عملاً سلفی تو نہیں تھے لیکن سلفیت کی طرف ان کا میلان ضرور تھا اور اس کے شواہد میں ان ہی کے قلم کی بہت سی تحریریں پیش کی تھیں۔ ان کے تمام مشاہیر اہل تصنیف وقلم علمائے

اہلحدیث سے بڑے مخلصانہ تعلقات تھے۔اس سلسلہ میں ''موج کوثر'' کے مصنف شیخ اکرم صاحب کی رائے بھی ان کے متعلق نقل کی تھی، جس کا اظہار انھوں نے خود دارالمصنفین ہی میں جب کہ وہ کاٹھ مانڈو سے ہوتے ہوئے جہاں وہ ایک سیمنار میں شرکت کے لئے لاہور گئے تھے۔ دارالمصنفین دیکھنے کے لئے آگئے تھے، کہا تھا کہ مولانا شبلی کے جو بھی عقائد رہے ہوں اوران کا جو بھی مسلک رہا ہو لیکن سید صاحب اپنے استاد کے خلاف زندگی کے آخیر تک سلفی رہے۔

میرا یہ مضمون ''فاران'' میں ان کی نظر سے گذر چکا تھا جس کو پڑھ کر وہ مجھ سے پہلے ہی کافی بدظن ہو چکے تھے۔ مولانا محمد تقی امینی نے ''احتساب'' کے مراسلہ کی صفائی میں ان سے کچھ عرض معروض کیا تو انھوں نے برجستہ فرمایا کہ اس سے کہیں زیادہ قابل اعتراض مضمون ان کا ''فاران'' کا ہے وہ ان سے مایوس ہو کر علی گڑھ واپس چلے گئے، لیکن وہ خود اپنے موقف پر قائم رہے اور میرا دفاع پورے خلوص سے کرتے رہے جس کے لئے میں اب تک ان کا شکر گذار ہوں۔ ایک عرصہ کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس کی تعلیمی موتمر کے موقع پر بنارس میں ملاقات ہوئی تو بڑی گرم جوشی سے ملے اور فرمایا کہ آپ کو یاد ہے کہ میں نے آپ کی حمایت میں بڑا سخت مورچہ لیا تھا۔ میں نے عرض کیا میں اس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں مگر اس کے نتیجہ میں آپ کی دارالمصنفین میں آمد و رفت یکا یک بند ہوگئی، اس کا افسوس ہے۔ کاش کہ آپ پھر اسی طرح آتے جاتے رہتے اور ہم نیازمندوں کو آپ کی زیارت و ملاقات کی سعادت حاصل ہوتی رہتی، مگر وہ پھر اب تک دارالمصنفین آئے نہیں اگر چہ اس مراسلہ کے ''احتساب'' میں شائع ہونے پر ان سے جو کشیدگی پیدا ہوگئی تھی وہ بالکل دور ہوگئی ہے، اس کے بعد ان کا ایک مضمون بھی ''معارف'' میں چھپا۔ اب ان کی تصنیفی زبان بجائے اردو کے عربی ہوگئی ہے۔ جامعہ سلفیہ کے بعض فضلاء ان کی عربی کتابوں کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی اس موتمر میں آنے کی ایک تقریب تھی جس کا خاص طور سے انھوں نے مجھ سے ذکر کیا۔

☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام

مولانا سید سلیمان ندوی کی آخری تحریر

سید صاحب اور لوگوں کی طرح پاکستان خدانخواستہ ہجرت کر کے نہیں گئے تھے جیسا کہ مولانا شاہ معین الدین ندوی نے ''حیات سلیمان'' میں لکھا ہے۔ بلاوے تو ان کے پاس پاکستان کے مختلف حلقوں کی طرف سے ایک عرصہ سے آرہے تھے، لیکن ان کی طبیعت کسی طرح پاکستان جانے کی نہیں چاہتی تھی کہ یکا یک ان کے پاس ان کی ایک نواسی کے ٹائیفائڈ بخار میں مبتلا اور بڑی لڑکی کے ولادت کے سلسلہ میں بیمار پڑ جانے کی اطلاع آئی تو ان کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو گئے، لیکن پاکستان جانے اوران بچیوں کی عیادت کرنے کی کوئی سبیل پیدا نہ ہو سکی۔ وہ اسی فکر میں تھے کہ اعظم گڑھ سے کانپور تار پہنچا کہ سچر کی قیادت میں خیر سگالی کا ایک وفد پاکستان جارہا ہے۔ جس کے ایک ممبر آپ بھی ہیں، آپ اس وفد میں شرکت کے لئے فوراً دہلی آجائیے۔ اس کو انھوں نے اپنے لئے فال نیک سمجھا اور کانپور سے دہلی روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اپنے پروگرام کے مطابق وفد پاکستان روانہ ہو گیا۔ بہر حال خیر سگالی وفد کے پرمٹ پر سید صاحب اپنی ان بیمار بچیوں کو دیکھنے کے لئے پاکستان روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچے تو وہاں معلوم ہوا کہ وفد آگے روانہ ہو گیا ہے، لیکن اس کے پروگرام کا کوئی علم نہیں ہے۔ کراچی میں بھی اس کی کوئی خبر نہیں ملی، نہ اس کے کسی ممبر سے ملاقات ہوئی۔ یہ سفر انھوں نے اپنے خرچ سے کیا لیکن چونکہ ہندوستان سے پچاس روپیہ سے زیادہ لے جانے کی اجازت نہیں تھی، اس لئے ان کو آگے بڑھنے کے لئے لاہور میں ایک دوست سے قرض لینا پڑا۔ یہ سفر گرمیوں میں ہوا تھا لیکن وہاں کا موسم بہت خوش گوار تھا، اسی درمیان میں رمضان شریف بھی آگیا تو رمضان شریف کا پورا مہینہ گذار کے ہندوستان جانے کا پروگرام

بنایا، اس کے لئے بآسانی ہندوستان جانے کے لئے پرمٹ بھی مل گیا تو یکا یک بے سان گمان بیمار ہو گئے اور وہ حسب پروگرام ہندوستان نہ جا سکے۔

قسمت کی خوبی دیکھئے کہ ٹوٹی کہاں کمند
دو ایک ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

پرمٹ کی مدت بھی ختم ہو گئی، صحت یاب ہونے کے بعد پرمٹ کی دوبارہ درخواست دی تو اس کے حصول میں ان کو بہت زیادہ پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔ بالآخر دوبارہ پرمٹ دینے سے ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر نے انکار کر دیا۔ اس لئے مجبوراً سید صاحب وہیں قیام پذیر ہو گئے اور بعد میں اپنے بال بچوں کو بھی ہندوستان سے بلوالیا۔ پھر اپنی دلچسپی کے لئے طرح طرح کے منصوبے ان کے دل میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ بالآخر اپنی تسکین کے لئے ''مکتبہ الشرق'' کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ اپنی نگرانی میں قائم کرلیا، اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی تو کیا عجب تھا کہ یہی آگے چل کر دارالمصنفین میں تبدیل ہو جاتا۔ اس کی طرف سے خود انہی کی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک ان کے سفر یورپ کے زمانہ کے خطوط کا مجموعہ ''برید فرنگ'' کے نام سے انہی کی زندگی میں شائع ہوا۔ دوسری ''یادرفتگاں'' جس میں ان کے وہ تاثرات، مضامین، اور شذرات ہیں جو انھوں نے اپنے سے تعلق رکھنے والے ہندوستان کے ہر طبقہ زندگی کے مشاہیر واعیان کی وفات پر ''معارف'' میں لکھے تھے۔ یہ ان کی وفات کے بعد اس کی طرف سے ان کے داماد سید ابو عاصم نے اپنے بہت ہی مفصل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

لیکن سید صاحب جب تک زندہ رہے اعظم گڑھ اور دارالمصنفین آنے کے لئے تڑپتے رہے، جس کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اور پروان چڑھایا تھا۔ کبھی اس کے غم سے ان کو نجات نہیں ملی۔ صحت تو درحقیقت ہندوستان کے زمانہ قیام ہی میں خراب ہو گئی تھی۔ وہاں طرح طرح کی فکروں سے اور زیادہ طبیعت خراب ہو گئی اور بالآخر ۱۸ر نومبر ۱۹۵۳ء میں چند روز کی بیماری میں انتقال کر گئے۔ موت اگر چہ برحق ہے اس سے مفر کی کوئی شکل نہیں ہے لیکن سید سلیمان اور موت تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس لئے جب ریڈیو سے خبر آئی تو دارالمصنفین میں قیامت

برپا ہوگئی۔ میں حسب معمول دارالمصنفین میں داخل ہوا تو شاہ صاحب نے آواز دی، ان کی زبان سے یہ خبر سنتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ان کے سارے اعزا کیا پورا دیسنہ پاکستان چلا گیا تھا، پھر بھی ہندوستان میں ان کے بہت سے اعزہ رہ گئے تھے مثلاً خود ان کے سگے بھتیجے مولانا سید ابوظفر ندوی تھے۔ جن سے انھوں نے ''تاریخ سندھ'' اور ''تاریخ گجرات'' لکھوائی تھی۔ مولانا سید نجیب اشرف ندوی تھے جن سے وہ بڑا تعلق رکھتے تھے اور جن کے قلم کا شاہکار اور ان کے دارالمصنفین کے رفاقت کی قابل فخر یادگار ''رقعات عالمگیری'' پر ان کا کتابی شکل میں مقدمہ ہے جس پر خود سید صاحب کو بڑا ناز تھا۔ ان کے بچپن کے دوست اور ساتھی سید ابو کمال عبدالحکیم دیسنوی تھے جن کو اپنے اعزہ میں سب سے زیادہ خط لکھے تھے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن تھے جن کو وہ اپنے بچے کے برابر مانتے تھے اور ان کی علمی امیدوں کے مرکز تھے اور ان کی ہر طرح کی ترقی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ان کے داماد سید حسین صاحب مچھلی شہری تھے جن سے ان کی دوسری صاحبزادی شکیلہ سلمہا منسوب تھیں جو ہندوستان ہی میں رہ گئی تھیں اور انہیں کے نام دیسنہ کی ساری جائداد اور املاک ہبہ کردی تھی۔ ان کے سالے سید اسلم تھے اور دارالمصنفین میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ تلامذہ میں مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔ جنھوں نے ان کی ''لغات جدیدہ'' کے جدید اڈیشن میں انہی کی فرمائش سے نہایت عالمانہ، فاضلانہ اور ماہرانہ مقدمہ لکھا تھا اور بہت سے نئے الفاظ اپنی تلاش وجستجو سے اضافہ کئے تھے۔ ان کے اتنے قدرداں تھے کہ ''معارف'' میں چھپنے کے لئے ان کا مضمون آتا تھا تو بغیر اس پر نظر ڈالے ہوئے پریس کے حوالے کردیتے تھے۔ یہ عزت ان کے تلامذہ میں کسی کو بھی حاصل نہیں تھی۔ وہ ان کے اسلوب کے بہت کامیاب مقلد تھے۔ اگر ان کی زندگی نے وفا کی ہوتی کیا عجب تھا کہ سید صاحب کی سوانح عمری وہی لکھتے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تھے جو انہی کی زندگی میں ندوہ کے ناظم ہوگئے تھے۔ مولانا عمران خاں ندوی تھے جنھوں نے ان کے زمانہ قیام بھوپال میں تاج المساجد کی تعمیر میں ہاتھ لگایا اور اس کو پایہ تکمیل کو پہنچادیا۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی تھے جو دارالمصنفین کے نئے نظام کے تحت اس کے ناظم علمی اور ''معارف'' کے اڈیٹر تھے۔ احباب میں مولانا مسعود علی ندوی تھے جو اس وقت دارالمصنفین کے ناظم انتظامی تھے۔ مولانا

عبدالسلام ندوی تھے۔جنھوں نے ان کے ایماء سے ''حیات شبلی'' کا خاکہ تیار کیا تھا اور ان کے خواجہ تاش تھے۔مولانا عبدالباری ندوی تھے جن کے علم وفضل اور فلسفہ دانی کے بڑے قائل تھے اور اپنی سیرت کی تیسری جلد میں فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں معجزات پر ان سے مضمون لکھوا کر شامل کیا تھا۔ اس حلقہ سے باہر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر رشید احمد صدیقی تھے جنھوں نے نہایت اخلاص سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنی بقیہ زندگی گذارنے کی ان سے استدعا کی تھی مگر اس علالت میں ان کو سب میں جو بزرگ ان کو یاد آئے وہ مولانا عبدالماجد دریابادی تھے۔وہ ان کو اپنے قلم سے اپنی زندگی کی آخری تحریر لکھ رہے تھے کہ ان پر ضعف غالب آگیا اور وہ اس کو پورا نہ کر سکے۔وہی ناتمام تحریر سید صاحب کے صاحبزادے اور ان کے صلبی جانشین میاں سید سلمان ندوی صدر شعبہ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ نے اپنے والد کے انتقال کے بعد مولانا کو بھیج دی۔وہ اس وقت ''مکاتیب سلیمانی'' کی دوسری جلد مرتب کر رہے تھے۔وہ تحریر بعینہٖ اس کے آخر میں شامل کردی۔اس تحریر سے ان کی ذات خاص کے ساتھ سید صاحب کے غیر معمولی تعلق اور اخلاص کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ تحریر بھوپال اور پاکستان کے غیر متوقع مصائب کی بہت ہی پردرد اور رقت انگیز داستان ہے جس کو پڑھ کر بے درد سے بے درد آدمی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔یہ ہندوستان کے ان نیشنلسٹوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔جنھوں نے سید صاحب کے پاکستان میں جبریہ قیام کو اپنی کذب بیانی سے گھنونا بنادیا تھا اور ان کو بھی ہندوستان سے بھاگنے والوں کی صف میں شامل کردیا تھا۔ ع:

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہوگیا

☆☆☆

میرا سفر پاکستان

از عبدالماجد دریابادی

مدت سے میرے پاکستانی احباب اور اعزہ کا تقاضا تھا کہ میں پاکستان آجاؤں اور اس کے لئے تعلیمی اور مذہبی حلقوں سے مجھے دعوت دی جاتی رہی اور میں اس کو ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ گذشتہ دسمبر ۱۹۴۹ء کو جب میں حج کے سفر میں تھا ہندوستان کے اخبارات نے بے بنیاد خبریں میرے پاکستان میں موجودگی کی شائع کیں اور یہاں تک کہ میرے منصب اور عہدہ کی بھی تعیین کردی گئی۔ جب میں واپس آگیا تب بھی میں نے اخبارات میں اپنا کوئی تردیدی بیان شائع نہیں کیا۔ ہمارے دوستوں کو معلوم ہے کہ جولائی ۱۹۴۶ء سے میرا قیام بھوپال میں بحیثیت قاضی ریاست اور ڈائرکٹر تعلیمات مشرقی تھا اور بحمداللہ تعالیٰ فرماں روائے ریاست سے لے کر عام مسلمانوں بلکہ کانگریسی وزراء تک میرا احترام کرتے تھے۔ بالآخر جب ۱۹۴۹ء کے وسط میں ملکی وزارت کا خاتمہ ہوا اور انڈین یونین کے حکام کا براہ راست تقرر ہوا اور ایک سر پھرے آئی سی ایس (I.C.S) کو کمشنر اور یوپی کے ایک ڈپٹی کلکٹر کو ڈپٹی کمشنر بنایا گیا اور ریاست کے محکموں کی شکست وریخت شروع ہوئی اور بحیثیت ریاست کے بھوپال کا وجود ختم کیا جانے لگا تو تعلیمات کے لائق وقابل مسلمان افسروں کو مختلف حیلوں سے برخواست کیا گیا اور سہور کے ایک معمولی ہیڈ ماسٹر کو چیف انسپکٹر کا عہدہ دے کر دوسو ماہوار پر مقرر کیا گیا اور مجھے عملاً اس کا ماتحت بنایا گیا جس کو میں نے بجا طور پر اپنی توہین سمجھا۔ کیوں کہ میری حیثیت ایک ڈائرکٹر کی تھی اور میرے قائم مقام بھی رخصتوں کے موقع پر ڈائرکٹر ہی ہوتے رہے۔ میری تنخواہ اس سے پنج گونہ زائد تھی۔ اسی درمیان میں آئینِ ہند کے دفعہ ۲۸ کے مطابق مشرقی مدارس کے علوم دینیہ کے مدرسین کی علاحدگی کے احکام نافذ کئے

گئے۔ میرے خیال میں یہ احکام اس لئے غلط تھے کہ ان مدارس میں علوم دینیہ کی تعلیم بحیثیت دینی علوم کے نہیں دی جاتی تھی بلکہ عربی ہائی لٹریچر کے طور پر دی جاتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ یوپی وزارت تعلیم کے ماتحت اور وزیر ہند مولانا ابوالکلام کے زیر صدارت مشرقی تعلیمات کا جو نصاب بنایا گیا اس میں یہ علوم اسی حیثیت سے داخل کئے گئے تھے اور وزیر تعلیم ہند کا ارادہ تھا کہ وہ اسی نصاب کو سارے ہند کے مشرقی مدارس میں جاری کریں گے اور ان کی خواہش تھی کہ دارالعلوم ندوہ سرکاری مشرقی کالج کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے اور جس کمیٹی نے نصاب بنایا تھا اس کا میں بھی ایک ممبر تھا۔ اس لئے میں نے کمشنر صاحب بھوپال کی خدمت میں اپنے یہ خیالات لکھ کر بھیج دیئے اور مزید زبانی تشریح کے لئے ملاقات کی خواہش کی۔ مجھے ایک مہینہ سے زیادہ اس کے جواب کا انتظار کرنا پڑا اور آخر یہ جواب دیا کہ آپ تو اسی صاحب ڈپٹی کمشنر سے ملیں۔ میں نے موصوف سے ملنے کی خواہش کی تو چند روز کے بعد وقت مقرر ہوا اس وقت مقررہ پر جب پہنچا تو معلوم ہوا کہ موصوف مصروف ہیں۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد سرفرازی ہوئی۔ اور جب میں پیش ہوا تو اس بے رخی سے پذیرائی ہوئی کہ ایک معمولی افسر کے ساتھ بھی کوئی شریف انسان یہ طریقہ نہ برت سکتا۔ حالانکہ موصوف کی تنخواہ مجھ سے بہت کم تھی اور اجگہ یہ معاملہ کیا گیا جہاں ریاست اور کانگریس کے وزراء نے ہمیشہ میرا احترام کیا اور اعزاز کیا۔ پھر باتیں بھی ایسی فرعونیت کے ساتھ کی گئیں کہ دل پر چوٹ لگی اور فرمایا گیا کہ اس میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کا کام حکم کی تعمیل ہے۔ میں نے وہیں پہلی بار دل میں عزم کیا کہ میں اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے دوں گا۔ چنانچہ واپس آ کر میں نے ۳ ماہ کی رخصت کی درخواست دی جو ایک ماہ میں منظور ہوئی اور عین اس وقت جب میں چلنے کو تیار تھا کسٹوڈین صاحب بھوپال کا نوٹس ملا کہ آپ نے چونکہ کچھ روپے پاکستان بھیجے ہیں اس لئے آپ پر مقدمہ چلایا جائے گا اور آپ کو انخلا کنندہ تصور کیا جائے گا اور آپ اپنی مملوکات کی فہرست پیش کریں، یہ بارہ سو روپیہ کا ارسال قانون بننے سے پہلے بھوپال بینک کے ذریعہ اپنے داماد اور بھتیجے کو میں نے ان کی طلب پر بھیجے تھے۔ میرے لئے عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی سرکاری مقدمہ میں ماخوذ ہوا۔ دل نے اذیت محسوس کی۔ بہر حال دوستوں کے مشورہ سے ایک وکیل کو مقرر کر کے میں

یوپی چلا گیا، ایک ماہ کے اندر وکیل نے مجھے مطلع کیا کہ پچھلے اجلاس میں آپ کو براہ راست حاضری کا حکم ہوا ہے اس لئے چلے آئیں۔ چنانچہ وقت مقررہ پر گرمی کے دنوں میں سفر کر کے بھوپال گیا اور کسٹوڈین صاحب کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت خلاف معمول وتوقع کسٹوڈین صاحب اخلاق سے پیش آئے اور فرمایا کہ گورنمنٹ آپ پر سے مقدمہ اٹھا لینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے۔ یہ بالکل خلاف توقع بات تھی۔ بہر حال اجلاس سے باہر آیا اور دوسرے دن اطلاع ملی کہ بالفعل یہ مقدمہ اٹھا لیا گیا، اسی درمیان کمشنر صاحب کی طرف سے ریاست کے مذہبی محکموں کی شکست کا اعلان ہوا اور قاضی کا منصب جو ریاست کا سب سے بڑا محکمہ تھا بغیر کسی سابقہ نوٹس کے ایک منٹ میں ختم کر دیا گیا، اس وقت میرے لئے سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ میں امیر جامعہ مشرقیہ (ڈائرکٹر) کے عہدہ سے استعفیٰ داخل کر دوں۔ چنانچہ میں نے استعفیٰ دے دیا اور بخوشی تمام قبول کر لیا گیا۔ اب ظاہر تھا کہ انڈین یونین کو بہر حال میری ضرورت نہ تھی اور یکم جون ۱۹۵۰ء کو بھوپال سے رخصت ہو گیا اور ساتھ ہی ہندوستان سے دل برداشتہ ہو گیا۔

میری کئی اولادیں بسلسلہ ملازمت پاکستان آچکی تھیں، ان کا تقاضا تھا اور اسی طرح میرے متعدد احباب میرے لئے کوشاں تھے کہ میں پاکستان آجاؤں، لیکن دل ترک وطن پر آمادہ نہ تھا، لیکن جب یہ خبر ملی کہ کراچی میں میری نواسی سخت قسم کے ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے اور میری بڑی لڑکی ولادت کے بعد سخت بیمار ہے تو دل کو بے چینی ہوئی اور چاہا کہ کسی طرح کراچی پہونچوں۔

مجھے مایوسی تھی کیوں کہ بھوپال سے تعلق منقطع ہو چکا تھا اور وطن سے میرا ابھی کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن عین اس وقت میرے پاس ایک تار ۲رجون ۱۹۵۰ء کو اعظم گڑھ سے کانپور پہنچا جس میں لکھا تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نئی دہلی سے تار دیتے ہیں کہ خیر سگالی وفد کا پرمٹ تیار ہے فوراً آئیے۔ میں نے اسی اطلاع کو امداد غیبی سمجھا اور گویا پہلے سے مجھے اس کا کوئی حال معلوم نہ تھا تاہم اولاد کی محبت کی خاطر غیر معلوم سفر کے لئے دوسرے دن شام کو دہلی روانہ ہو گیا اور مولانا حفظ الرحمٰن کو اور ایک دوست کو تار سے اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔ صبح کو جب دہلی اسٹیشن پر پہنچا تو مولانا نظر نہ آئے، لیکن میرے دوست آگئے تھے ان سے آمد کی غرض بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ پچر

صالب کا وفد تو جا چکا اور اب کوئی وفد نہیں جا رہا ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا میں حفظ الرحمٰن صاحب سے ملا۔ انھوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی اور اس تار سے اپنی قطعی بے تعلقی کا اظہار کیا اور پھر تحقیقات کے بعد مطلع فرمایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادہ عزیز الرحمٰن نے وہ تار دیا تھا اور ان کا بیان ہے کہ آپ کا پرمٹ تیار ہے یا تیار ہو سکتا ہے۔ میں نے ان سے سفر کی ذاتی غرض بیان کی تو مولانا نے مجھے بجا طور پر مشورہ دیا کہ آپ کو اس پرمٹ کے بجائے اپنے وطن کے کلکٹر سے حاصل کرنا چاہئے۔ میں نے عرض کیا کہ افسوس کہ مجھے میرے وطن کے حکام نہیں جانتے اور وہاں سے مشکل سے مجھے یہ اجازت نامہ مل سکتا ہے۔ اس لئے یہیں مرکز سے مجھے یہ اجازت نامہ دلوا دیں۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی۔ بالآخر میں نے اسی خیر سگالی وفد کے پرمٹ سے فائدہ اٹھانے کا قصد کیا اور احباب کی کوشش سے ۹ رجون کو وہ بن کر میرے پاس آ گیا اور میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب لاہور کو اپنی آمد کی اطلاع دلوائی اور دوسرے دن ۱۱ رجون کو دوپہر کو بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچ گیا۔ یہاں ہوائی اڈہ پر ڈپٹی کمشنر صاحب ازراہِ عنایت ملے، لیکن فرمایا کہ وفد کے ممبر یہاں نہیں ہیں۔ آگے بڑھ گئے اور کوئی پروگرام بھی معلوم نہیں ہے۔ میں اب اس حالت میں تھا کہ چونکہ پچاس روپیہ سے زیادہ ساتھ لانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے آئندہ سفر کے تعین کے لئے ایک دوست سے روپے قرض لینے پڑے اور میں ریل سے ۱۴ رجون کو کراچی پہنچا۔ یہاں بھی وفد کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہ ہوا اور نہ اس کے کسی رکن سے ملاقات ہوئی اور سچ یہ ہے کہ میں نے اس سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کیوں کہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ وفد واپس جا رہا ہے یا جا چکا ہے۔ بہر حال میں نے جس غرض کی خاطر یہ سفر کیا تھا اور ذاتی مصارف سے کیا تھا اس کے لحاظ سے میں نے وفد کا پابند اپنے آپ کو نہیں بنایا۔ دو چار ہی روز میں رمضان شریف شروع ہو رہے تھے۔ قصد کیا کہ یہاں کے ٹھنڈے موسم میں رمضان بسر کر کے واپس جاؤں۔ چنانچہ میں نے یہی ہندوستان کے احباب کو لکھ دیا۔ رمضان کے بعد انڈین ہائی کمشنر کے دفتر میں پرمٹ کی درخواست دی تو پہلے پرمٹ سے انکار کیا گیا پھر یہ جواب ملا کہ دہلی تار دے کر پوچھا جائے گا۔ چنانچہ اس میں چند روز لگے اور جواب آنے پر پرمٹ دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ جلدی نہیں جب چاہے پرمٹ لے جایئے

اور ایک فارم بھرنے کا حکم ہوا جس میں عجیب عجیب خانے تھے، جس کو بھرنے کا جی نہ چاہا۔ بالآخر فارم بھر کر داخل کیا گیا تو اب انڈین ہائی کمشنر کے دفتر کو اصرار ہوا کہ میں بذات خود ان کے دفتر میں حاضر ہو کر پاسپورٹ آفیسر کے سامنے دستخط کروں وہاں جو سلوک دفتر کے چپراسی نے کیا اس سے دل کو چھوٹ لگی۔ خیر پھر یہ پرمٹ ملا۔ اتفاق سے کچھ طبیعت خراب ہوگئی، اس لئے پرمٹ کی توسیع کو درخواست دی، جس سے انکار کر دیا گیا۔ ابھی میں اس حالت میں تھا کہ ہندوستان سے بعض دوستوں نے لکھا کہ پاکستان کے اخبارات آپ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے یہاں بڑی بدگمانی پیدا ہو رہی ہے۔ میں نے لکھا کہ ان اخباروں کو روکنا میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اخبارات نے میرے یہاں آنے پر خیر مقدم کے مضامین اور نوٹ لکھے تھے اور حسن ظن کا اظہار کیا تھا یا بعض مجالس میں میری تقریروں کے اقتباسات چھاپے تھے۔ اس سے ہندوستانی اخباروں کے بعض تراشے ہندوستان کے احباب نے مجھے بھیجے جن سے معلوم ہوا کہ میرے کراچی پہنچنے کے چار ہی روز بعد دہلی کے ایک اخبار میں یہ مفتریانہ نوٹ شائع ہوا۔

ایک اور خط سید صاحب کا عبدالماجد دریابادی کے نام

''مکتوبات سلیمانی'' جلد دوم سے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام سید صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی کی آخری تحریر جو ان پر ضعف غالب آجانے کی وجہ سے مکمل نہ ہوسکی۔ نقل کر چکا تو اسی جلد میں انہی عبدالماجد دریابادی کے نام سید صاحب کے ایک اور خط پر نظر پڑی جو انھوں نے ان کو بحیثیت صدر مجلس عاملہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے لکھا ہے۔ اس پر مولانا دریابادی کا حاشیہ ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے مگر یہ شروع نومبر ۱۹۵۳ء کا سید صاحب کی وفات سے چند ہی ہفتہ قبل کا ہے۔ میرے نام شخصی نہیں بلکہ بحیثیت صدر مجلس عاملہ دارالمصنفین ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ سید صاحب اور منیجر دارالمصنفین مولانا مسعود علی کے اختلافات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔

یہ خط مجلس عاملہ کے سامنے پیش ہوا اور مجلس نے ایسا فیصلہ کیا جس سے سید صاحب کی شکایتیں عملاً دور ہو جائیں، لیکن قبل اس کے کہ اس فیصلہ پر عمل ہو سید صاحب کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد سارے مطالبات سید صاحب کی اہلیہ محترمہ کو رفتہ رفتہ ادا کر دیئے گئے اور خود مولانا مسعود علی صاحب کا دل بھی اپنے مکرم رفیق بزرگ کی جانب سے بالکل صاف ہو گیا۔

یہ خط سید صاحب کے ہاتھ کا نہیں کسی اور کا لکھا ہوا ہے۔ صرف آخیر میں دستخط سید صاحب کی ہے۔ یہ خط گویا مولانا مسعود علی کے خلاف استغاثہ ہے۔ اس خط کی Main باتیں یہ ہیں:

''میں جب سے یہاں آیا دارالمصنفین اور ''معارف'' کی اسی طرح طرح بنیاد ڈال سکتا تھا جس طرح مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن میں نے دارالمصنفین کے مفاد کے پیش نظر کبھی اس کا خیال نہیں کیا، اگر آپ لوگوں کا یہی رویہ رہا تو مجھے بھی اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنی پڑے گی۔

اگر واقعی میری قدر آپ کے دلوں میں ہوتی تو ارکانِ مجلس منتظمہ اور ارکان مجلس عاملہ یا ناظم امور انتظامی دارالمصنفین میں میری واپسی کے لئے بھی اصرار کرتے یا مجھ سے درخواست کرتے اور میرے قیام دارالمصنفین پر مصر ہوتے۔ (سید صاحب کے اس پیراگراف پر نظری پڑی تو مجھے بے اختیار اپنا ایک مضمون یاد آ گیا جو میں نے پاکستان سے سید صاحب کو واپسی کے لئے ان کے ہمدردوں کی کوششوں کو معلوم کرنے کے لئے لکھا تھا اور اس ڈر سے اخبار میں نہ بھیج سکا کہ کہیں میں اس مضمون کی اشاعت پر دوبارہ عتاب میں نہ آ جاؤں، وہ مضمون آپ آگے ملاحظہ کیجئے) احباب خاص نے مشورہ دیا کہ آپ کا ہندوستان میں اب کوئی کام نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اب دارالمصنفین کو میرے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہی میرے سامانوں کی خریداری شروع ہو گئی جس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ میرے احباب کو میرے یہاں رہنے پر سرے سے اصرار نہیں ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ اگر میں یہاں

رہوں تو مجھے چار سو ماہوار دیا جائے گا۔ گویا اس کے فیصلہ کا حق بھی ناظم صاحب امور انتظامی کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ پورا خط مولانا مسعود علی کی شکایتوں سے لبریز ہے مگر مولانا نے ان کی طرف سے وکالت کا بھی پورا حق ادا کر دیا ہے، اس سے مولانا مسعود علی کی روح تو ضرور خوش ہوئی ہوگی مگر کیا سید سلیمان ندوی کی روح کو بھی اتنی ہی خوشی ہوئی ہوگی؟

خاکسار تو ان دونوں بزرگوں کے ہر دور کے تعلقات کا چشم دید گواہ ہے۔ مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ آخیر میں "مولانا مسعود علی صاحب کا دل بھی اپنے مرحوم رفیق بزرگ کی جانب سے بالکل صاف ہوگیا" میرا خیال ہے کہ دونوں بزرگ دنیا سے ایک دوسرے سے ناراض گئے۔

وظیفہ کے لینے یا نہ لینے کے معاملہ میں سید صاحب اور مولانا مسعود علی ندوی اور دوسرے ارکان میں کیا طے ہوا تھا اس کا علم نہیں، مگر اس وقت یہی مشہور تھا کہ دار المصنفین میں نہ رہنے کی صورت میں سید صاحب اپنا وظیفہ بحق دار المصنفین ہبہ کر دیں گے۔ اس کو نہیں لیں گے، لیکن بھوپال کی حکومت کے بدل جانے سے سید صاحب کو وہاں سے ہٹنا پڑا تو تیار نہیں تھے۔ ان کی اپنی رائے بہر حال یہی تھی، یہ اور بات ہے کہ مولانا شاہ معین الدین ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے دباؤ سے کہ ان دونوں سے بھی مولانا مسعود علی ندوی صاحب کے تعلقات اچھے نہیں تھے اور سید صباح الدین صاحب سے تو ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ انھوں نے وظیفہ دینا منظور کر لیا اور واقعی بھوپال سے الگ ہونے کے بعد جن مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے تھے اس میں اس وظیفہ کی ان کو سخت ضرورت بھی تھی کہ ان کا خرچ کیسے چلتا۔ مروت و اخلاق کا تقاضا تھا کہ اگر سید صاحب نے ان کے خلاف امید اپنے سالہا سال کے وظیفہ کو طلب کیا تھا تو پوری فراخ دلی کے ساتھ منظور کر لینا چاہئے تھا۔ اس میں لیت و لعل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر ڈھائی سو ماہوار کے حساب سے بھوپال کے زمانہ قیام کا مجموعی معاوضہ کتنا ہوتا ہی تھا کہ مولانا مسعود علی کو اس کے دینے میں تکلف ہوا۔

☆☆☆

سید سلیمان ندوی صاحب کا پاکستان کا سفر

پاکستان کا سفر تو سید صاحب نے بلاشبہ ذاتی ضرورت سے کیا تھا، دو بچیوں کے ایک ساتھ بیمار پڑ جانے کی خبر نے ان کو بے چین اور مضطرب کر دیا اور وہ بادل ناخواستہ پاکستان جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے لئے اتفاق سے ایک تقریب بھی نکل آئی اور وہ پاکستان پہنچ گئے۔ اس سفر کے پورے اخراجات انھوں نے اپنی جیب سے ادا کئے۔ اس سلسلہ میں کسی کا بھی ان کو شرمندہ احسان نہیں ہونا پڑا۔ پاکستان شروع سے لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے جاتے ہیں، اسی طرح جب سید صاحب کو بھی اپنی بچیوں کی علالت کی خبر ملی تو وہ بھی اور لوگوں کی طرح عازم پاکستان ہو گئے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، پھر وہ سیاسی نہیں خالص علمی آدمی تھے جن کے مشاغل علم وادب کی خدمت تک محدود تھے، اور سوائے لکھنے پڑھنے کے اور کسی کام سے سروکار نہیں تھا۔ یوں تو ان کے حلقۂ احباب میں ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر واعیان تھے لیکن ان کے تعلقات اہل علم اور اصحاب قلم ہی سے زیادہ تھے اور ان سے مکاتبت اور مراسلت کا سلسلہ بھی قائم تھا۔ ان میں ہر مسلک ہر مذہب، ہر عقیدہ اور ہر ملک کے لوگ شامل تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے، ہندو بھی، سکھ بھی، عیسائی بھی۔ پھر یورپین، امریکن، ایشیائی، افریقی، عرب اور غیر عرب سب شامل تھے اور ان کو سید صاحب کی دوستی پر فخر تھا۔ سیاست سے عملاً کسی دور میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ اس کا ذوق ہی رکھتے تھے۔ ان کے پاکستان سے واپس آنے پر ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر والوں نے کیوں روک ٹوک کی، کم از کم ان کی اصل حیثیت تو سمجھ لینی چاہئے تھی۔ خیر سگالی کا جو وفد پاکستان گیا تھا، اس کے لئے ہی ان کا انتخاب ہوا تھا، جس کی اطلاع ان کو ایسے وقت ملی کہ جب وہ دہلی پہنچے تو وفد ان کا انتظار کر کے پاکستان روانہ ہو چکا تھا۔ بچیوں کی عیادت کے لئے ان کا پاکستان جانا ضروری تھا، اسی لئے اس وفد کے پرمٹ پر وہ پاکستان روانہ ہو گئے۔ لاہور پہنچے تو معلوم ہوا کہ وفد یہاں

سے آگے بڑھ گیا ہے اوراس کے پروگرام کا کوئی علم نہیں ہے، لاہور میں اپنے کسی دوست سے قرض لے کر کراچی گئے تو وہاں بھی وفد کا نہ پتہ چلا اور نہ اس کے کسی ممبر سے ملاقات ہوئی۔ ان کے قیام کے دوران میں رمضان شریف بھی آگیا، سوچا کہ یہاں کا موسم مقابلۃً خوشگوار ہے، اس لئے پورا رمضان گزار کے یہاں سے واپس جانے کا انھوں نے پروگرام بنایا اور رمضان ختم ہوا تو ہندوستان جانے کے لئے پرمٹ کی درخواست دی اور ان کو پرمٹ مل گیا، لیکن بدقسمتی سے بے شان وگمان بیمار پڑ گئے۔ بیماری اس قدر طول کھنچ گئی کہ اس پرمٹ کی میعاد ختم ہوگئی۔ جب دوسری مرتبہ پرمٹ کی درخواست دی تو ہائی کمشنر کے دفتر والوں نے پرمٹ دینے سے حیرت انگیز طور پر انکار کردیا، مجبوراً ان کو وہیں رہ جانا پڑا جس کو انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔ اس کا علم ہوجانے کے بعد دارالمصنفین کے ذمہ داروں کا فرض تھا کہ ان کو پاکستان سے واپس لانے کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے جب کہ وہ اور لوگوں کی طرح ترک وطن کرکے پاکستان نہیں گئے تھے جیسے مولانا حسین احمد مدنی غفراللہ مولانا قاری محمد طیب صاحب کو جو ترک وطن کرکے پاکستان چلے گئے تھے اور وہاں کے شہری ہو گئے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم ہند کے ذریعہ وہاں کی شہریت ختم کراکے ہندوستان لائے۔ اور ان کو دوبارہ یہاں کا شہری بنایا اور دارالعلوم کا اہتمام ان کے سپرد کیا جس پر بحمداللہ وہ اب تک فائز ہیں۔ اب کسی کو خیال بھی نہیں گذرتا ہوگا کہ یہ کبھی پاکستان گئے تھے اور وہاں کے شہری ہو گئے تھے، اگر سید صاحب کا دارالمصنفین میں رہنا ضروری سمجھا جاتا تو یہی سب کچھ ان کے لئے بھی کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل سے پنڈت جواہر لال نہرو بھی زندہ تھے۔ مولانا ابوالکلام بھی زندہ تھے اور رفیع احمد قدوائی بھی زندہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس بہت اہم پورٹ فولیو تھے، جواہر لال تو وزیراعظم ہی تھے ان سب سے سید صاحب کے بہت غیر معمولی تعلقات تھے۔ وہ ان کے سیاسی نظریات سے واقف، ان کے فضل وکمال کے قدرداں بھی تھے۔ پھر سید صاحب ایک زمانہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہ چکے تھے اور ان کا انتخاب احمد آباد کانگریس کے موقع پر جس کے صدر حکیم اجمل خان تھے، خود گاندھی جی نے اپنی پسند سے کیا تھا اور ان کے متعلق یہ کہا تھا کہ یہ مولوی بڑا اپٹر معلوم ہوتا ہے یعنی یہ بڑے دانشمند عاقل

اور فرزانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ان حضرات کے ذریعہ خلوص کے ساتھ کوشش کی جاتی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ سید صاحب واپس نہ آتے۔ اگر پاکستان میں مختلف حلقوں کی طرف سے ان کا پر جوش خیر مقدم ہوا ان کے شایان شان ان کا اعزاز و اکرام ہوا، ان کی آمد کی خوشی میں طرح طرح سے وہاں کے لوگوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ بیانات دیئے۔ جلسے کے لئے خیر مقدمی نظمیں لکھیں۔ اخبارات نے اداریے لکھے تو یہ نہ صرف پاکستان پورے عالم اسلام کے ایک زبردست عالم اردو زبان کے ایک عظیم مصنف وقت کے ایک ممتاز سیرت نگار اور دارالمصنفین جیسے عالمی، تصنیفی ادارے کے بانی اور ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے ہوا۔ وہ جس ملک میں بھی جاتے ان کا اسی طرح اعزاز و اکرام ہوتا، اگر پاکستان میں ہوا تو تعجب کی کیا بات ہے۔ اس گرم جوشانہ پذیرائی اور پر خلوص استقبال سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ سید صاحب نے اپنے محبوب وطن ہندوستان پر جہاں ان کا سب کچھ تھا جس کے لئے انھوں نے علمی جہاد کیا، زندگی بھر کانگریس کے ہم آہنگ رہے، پاکستان کو ترجیح دی۔

وہ وہاں خدانخواستہ بسنے اور آباد ہونے کے لئے تشریف نہیں لے گئے تھے، یہ سراسر ہندوستان کے ہائی کمشنر کے دفتر کی بدگمانیاں تھیں، ان کا کوئی تعلق حقیقت اور واقعیت سے نہیں تھا، اگر اس کھلے ہوئے ظلم و ناانصافی کی طرف پنڈت جواہر لال نہرو، اور مولانا ابوالکلام آزاد کو توجہ دلائی جاتی تو یہ حضرات اس پر ضرور غور کرتے اور ان کی وہاں سے واپسی کی کوئی شکل ضرور سوچتے۔ اس کام کو ایک مہم کے طور پر انجام دینا چاہئے تھا اور جب تک یہ خاطر خواہ انجام نہ پاتی نچلا نہیں بیٹھنا چاہئے تھا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ دارالمصنفین کے اس وقت کے ذمہ داروں نے اس سلسلہ میں کیا کوششیں کیں، کتنی مرتبہ دہلی جا کر پنڈت جواہر لال سے ملے، مولانا ابوالکلام آزاد سے ملے۔ حکومت کے دوسرے ذمہ داروں سے ملے۔ ان کی صفائی میں اخبارات نے کتنے بیانات دیئے۔ خود ''معارف'' میں کتنا لکھا گیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ خود مولانا مسعود علی ندوی جن کے پنڈت جواہر لال نہرو مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی سے براہ راست تعلقات تھے اور بارہا نہرو خاندان کی میزبانی کا شرف بھی

حاصل کر چکے تھے، ان کو پاکستان سے واپس بلانا پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے دارالمصنفین میں کوس لمن الملک بجانے میں فرق آجاتا، وہ اس کے بلاشرکت غیرے مالک رہنا چاہتے تھے اور وہ کہتے بھی تھے کہ دارالمصنفین کو دارالمصنفین بنانے میں میرا دخل ہے۔ اس سلسلہ میں میری خدمات سید صاحب سے بہت زیادہ ہیں۔ سید صاحب تو زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ آج مدراس میں ہیں، کل بمبئی میں اور پرسوں کہیں اور۔ دارالمصنفین سے تعلق کے زمانہ میں ان کے سفروں کا طویل سلسلہ آخیر وقت تک قائم رہا اور میں ان کی عدم موجودگی میں دارالمصنفین کا اندرونی نظام قائم کیے ہوئے تھا اور اس میں فرق نہیں آنے دیا۔

اگر یہ صحیح ہے تو کیا دارالمصنفین کے اندر دوسرے لوگ بھی کیا خدانخواستہ ان کا پاکستان سے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خود ان کی کوششوں کا رکارڈ کیا ہے۔ ان کی جدوجہد کی روداد کیا ہے۔ ان کی تگ ودو کی تفصیل کیا ہے۔ ''معارف'' کو اس سلسلہ میں کہاں تک استعمال کیا گیا، اس کی آواز تو بہت دور دور تک پہنچتی تھی۔

دارالمصنفین کی ایک مجلس انتظامیہ بھی جس کے ممبر ملک کے بااثر حضرات ہیں۔ ان لوگوں نے کیا کوششیں کیں اور اپنے اثرات کہاں تک استعمال کیے۔ ان سب کا تاریخ کے صفحات میں آنا ضروری ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ سید صاحب کے ان کی مرضی کے خلاف پاکستان میں قیام کا جو حادثہ پیش آیا اس پر صبر کر لیا گیا اور ان کی وہاں سے واپسی کی کوشش کو ضروری نہیں سمجھا گیا اور فوراً دوسرا انتظام قائم کر لیا گیا اور اس پر سید صاحب سے مہر تصدیق بھی ثبت کرالی گئی اور ان کی اپنی زبان سے یہ کہلوا بھی دیا گیا کہ میں نے اپنے بعد کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، مگر ان کے دل پر جو بیت گئی ہوگی اس کا اندازہ بھی ہر شخص کر سکتا ہے۔ ''معارف'' کے ٹائٹل سے ان کا نام بھی نکال دیا گیا گو اس کا اعتراف نہ کیا جائے مگر اس سے اس کی ساکھ پر ضرور اثر پڑا ہوگا۔ لوگ ''معارف'' کے محققانہ، عالمانہ، فاضلانہ اور فنی مضامین کو بہت کم پڑھتے تھے لیکن سید صاحب کے شذرات اور وفیات کے تحت ان کی نگارشات کو بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتے تھے۔ وفیات کو تو ایسی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی اور وہ اتنے رقت انگیز ہوتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ تمنا پیدا ہو جاتی

تھی کہ کاش، ہم سید صاحب کی زندگی میں مرتے اور سید صاحب ہمارا مرثیہ لکھتے۔ ان کے شذرات کو بھی اسی طرح کی مقبولیت حاصل تھی، اس کے تیرونشتر سے لوگوں کے دل برما جاتے تھے۔ یہ اردو ادب کی ایک نئی صنف قرار پا گئی تھی، بلکہ اس کو طنزیات، فکاہات کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے، جس پر رشید احمد صدیقی نے پوری ایک کتاب لکھ دی ہے۔ ''معارف'' کے بعد جو بھی نیا رسالہ نکلتا تھا اپنے اداریہ کے لئے یہی عنوان یا اسی کے ہم وزن دوسرا عنوان اختیار کرتا تھا جب لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ ''معارف'' کے ٹائٹل سے سید صاحب کا نام نکال دیا گیا ہے تو مجھے پورا یقین ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کی خریداری بند کر دی ہوگی کہ جب سید صاحب کے دلچسپ شذرات ہی نہیں ہیں تو کیوں خریدا جائے۔

دارالمصنفین، معارف، سید سلیمان ندوی ایک ہی مسمیٰ کے تین نام تھے کہ ایک کا تصور بغیر دونوں کے تصور کے ناممکن تھا۔ سید صاحب کا نام لیتے ہی دارالمصنفین اور ''معارف'' کا نام آجانا ضروری ہوجاتا تھا۔ اسی طرح ''معارف'' اور دارالمصنفین کے تصور کے ساتھ سید صاحب کا تصور بھی ضروری تھا اور سید صاحب کی زندگی ہی میں یہ تصور ختم کر دیا گیا۔

اب سید صاحب بھی دنیا میں نہیں رہے اور ان کو پاکستان سے واپس لانے والے بھی ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھ گئے اور اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہوگیا ہے، مگر تاریخ میں تو آجانا چاہئے کہ ان کو واپس لانے میں دارالمصنفین کے ذمہ داروں، اس کی مجالس عاملہ ومنتظمہ کے باا ثر ومعزز ومقتدر ارکان نے کیا کوششیں کیں۔ انھوں نے یہاں کی حکومت کو پنڈت جواہر لال نہرو کو اور ان کی کیبنٹ کے دوسرے ارکان کو اس کی طرف توجہ دلائی کہ نہیں۔ اگر دلائی تو کیا دارالمصنفین میں اس کا رکارڈ محفوظ ہے۔ ''حیات سلیمان'' مؤلفہ مولانا شاہ معین الدین ندوی میں اس کے متعلق ایک حرف موجود نہیں ہے بلکہ ہجرت پاکستان کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ازخود یہاں سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اور پھر ہمیشہ کے لئے وہیں مقیم ہوگئے۔ وہ پاکستان میں خدانخواستہ رہنے کے لئے نہیں اپنی بیمار لڑکی اور نواسی کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے اور جب وہ صحت یاب ہوگئیں اور سید صاحب کو ان کی صحت کی طرف سے پورا

اطمینان ہوگیا تو اور لوگوں کی طرح وہاں سے واپسی کی تیاریاں شروع کردیں، لیکن اس سلسلہ میں ہندوستان کے سفارت خانہ نے ان کے ساتھ سخت قساوتِ قلبی کا ثبوت دیا اوران کو پریشان کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، یہاں تک کہ وہ اپنے وطن مالوف ہندوستان واپس جانے کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئے اور وہیں رہ پڑے بعد کو اپنے متعلقین کو بھی وہیں بلالیا، لیکن جب تک وہ زندہ رہے اعظم گڑھ اور دیسنہ کے لئے تڑپتے رہے تا آنکہ ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور وہیں پیوندِ زمین بھی ہوگئے۔ جس کا انھوں نے اپنی زندگی میں خواب بھی نہیں دیکھا تھا وہ تو دارالمصنفین ہی میں اپنے استاد مولانا شبلی کے مزار پرانوار کے پہلو میں وہاں کی مسجد سے بالکل متصل پورب طرف اپنی ابدی خواب گاہ بنانا چاہتے تھے۔ افسوس کہ حالات کی نامساعدت اور اس سے کہیں بڑھ کر مشیت ایزدی سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہے ان کی زندگی کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے اور اس سیرت نگار رسول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب عطا کرے۔ ع: ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

اس سے مقصود یہ معلوم کرنا ہے کہ سید صاحب کے دشمنوں، معاندوں، بدنفسوں، بدخواہوں اور حاسدوں نے جو کچھ کیا وہ تو کیا خود مخلصوں، محبوں، بہی خواہوں، دوستوں اور اپنوں نے اس سلسلہ میں کیا رول ادا کیا تا کہ ان کے سوانح حیات کا یہ خلا بھی پُر ہو جائے اور سید صاحب کی زندگی کا کوئی گوشہ لکھنے سے نہ رہ جائے۔

سید صاحب سے اختلاف کی ایک لمبی داستان ہے اس میں اسی حد تک بیان کی گئی ہے، جہاں تک مولانا عبدالماجد دریابادی سے تعلق تھا، اس سلسلہ کی بہت سی باتوں کا علم مولانا دریابادی کو بھی نہیں تھا اور نہ دریاباد میں رہ کر ان کو معلوم ہوسکتی تھیں۔ اختلاف اصل میں سید صاحب کے ادبی وتنقیدی مضامین کے مجموعہ ''نقوش سلیمانی'' کے دوسرے اڈیشن کے سلسلہ میں شروع ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہوگیا تو دوسرا اڈیشن بھی اسی اہتمام کے ساتھ معارف پریس میں چھپوانا چاہا جس سے مولانا مسعود علی کو اس بنا پر اختلاف ہوگیا کہ اور لوگ تو طرح طرح سے اس ادارہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مالی منفعت حاصل کر رہے ہیں، اپنی ذاتی کتابیں اس ادارہ کے خرچ سے چھپواتے

ہیں اوران کی ایجنسی یہیں سے قائم کر کے یہیں سے فروخت کراتے ہیں اور اسی فروخت کی آمدنی سے خرچ پورا کرتے ہیں اور مجھ کوصرف اپنی مقررہ تنخواہ پر قانع رہنا پڑتا ہے جس کا سید صاحب کو بہت ملال ہوا، اس دوران میں اپنی طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے میرے کمرے میں بھی کبھی کبھی آجاتے تھے، میں نے ان سے پوچھا کہ ''نقوش سلیمانی'' کی کتابت وطباعت کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو فرمایا ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی کتابت کے لئے قادر خاں سے بات چیت کروں، فرمایا کہ کیا وہ تیار ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھ کو تو امید ہے۔ مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے ان سے بات چیت کی یا نہیں۔ بہر حال وہ کتاب سید صاحب کی ہزاروں خواہش وتمنا کے باوجود ''معارف'' پریس میں دوبارہ نہیں چھپ سکی اور اسی کا ملال لے کر سید صاحب یہاں سے گئے۔ پاکستان جانے کے بعد وہاں اس کا دوسرا اڈیشن چھپا تو اس کے دو حصے کر دیئے گئے، پہلا تو چھپا اور وہ دارالمصنفین میں موجود بھی ہے، لیکن دوسرا حصہ نہیں چھپ سکا اور اب تک اہمال میں پڑا ہوا ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن موجودہ ناظم دارالمصنفین نے پہلے اڈیشن کا عکس لے کر نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا ہے۔ سید صاحب ہوتے تو اس کو دیکھ کر خوش ہوتے کہ جو کام ان کی خواہش کے باوجود ان کی زندگی میں نہیں ہوسکا ان کے مرنے کے بعد ہو گیا اور وہیں ہوا جہاں سے اس کے دوبارہ چھاپنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

سید صاحب پاکستان کے زمانہ قیام میں ایک مرتبہ اپنے ہندوستانی عزیزوں سے ملنے ہندوستان آئے تھے اور ان کا قیام اپنے داماد سید حسین صاحب مچھلی شہری ڈپٹی کلکٹر کے یہاں فتح پور میں تھا۔ اس کی خبر دارالمصنفین آئی تو مولانا شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شہر کے بسکٹوں کے مشہور تاجر اور شبلی منزل کے حاضر باش حاجی عبدالغفور صاحب خستہ اُن سے ملنے کے لئے فتح پور گئے۔ اس زمانہ میں مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی اہلیہ موضع بھیارہ میں بیمار تھیں۔ مولانا مسعود علی کو شکایت اور ملال تھا کہ اتنے قریب آکر بھی سید صاحب ان کی اہلیہ کی عیادت کے لئے موضع بھیارہ نہیں آئے، اس کو انھوں نے سید صاحب کی بے مروتی پر محمول کیا اور وہ سید صاحب سے ملنے کے لئے فتح پور اور لکھنؤ نہیں گئے۔ معلوم نہیں کہ مولانا مسعود علی کو ویزا کے

قانون اور قاعدہ کا علم تھا یا نہیں۔ یہاں آکر وہ وہیں جاسکتے تھے جہاں جانے کی ویزا میں اجازت تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فتح پور کے بعد وہ صرف قانوناً لکھنؤ ہی جاسکتے تھے اور وہیں گئے بھی۔ ورنہ وہ اعظم گڑھ ضرور آتے جہاں آنے کی سب سے زیادہ کشش ان کے دل میں پیدا ہوئی ہوگی۔ سید صاحب فتح پور سے چند دن کے لئے اہل ندوہ سے ملنے کے لئے لکھنؤ آئے۔ اگر مولانا مسعود علی کسی وجہ سے فتح پور نہیں جاسکتے تو ندوہ تو جاسکتے تھے، مگر ندوہ بھی نہیں گئے۔ ندوہ میں سید صاحب کا قیام کئی دن رہا، لڑکوں نے ان کی آمد میں نہایت شاندار وخیر مقدمی جلسہ کیا۔ سپاس نامہ پیش کیا۔ تقریریں کیں۔ نظمیں پڑھیں۔ سید صاحب نے اس کے شکریہ میں بہت ہی پرسوز تقریر کی اور آخر میں جگن ناتھ آزاد کا یہ مشہور شعر پڑھا جس کو سن کر پورا مجمع تڑپ گیا اور سید صاحب کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں ۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانندِ مہمان کے آیا ہوں

ندوہ سے واپسی کے بعد پھر وہ پاکستان واپس چلے گئے۔ اس کے بعد دوبارہ ہندوستان آنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں سید صاحب کی کچھ رقم رہ گئی تھی، اس کی ادائیگی کی ایک صورت سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے یہ سوچی کہ سید ابو عاصم صاحب کے ذریعہ ان کے پاس بھیجنے کے لئے سید صاحب کے نام "مشاہیر کے خطوط" مجھ سے لکھوانے شروع کئے جس کو سید صاحب مکتبہ الشرق کی طرف سے شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کی اجرت سید صاحب کی اسی رقم سے صباح الدین صاحب مجھ کو دیتے رہے۔ اس سلسلہ میں آپ یہ بات افسوس کے ساتھ سنیں گے کہ جب میں نے اس کے لئے دفتر سے حسب معمول کاغذ لینا چاہا تو اس وقت کے پریس اور کاغذ کے گودام کے انچارج محمد صدیق صاحب نے مولانا مسعود علی کی ایماء سے کاغذ دینے سے انکار کردیا کہ سید صاحب کے کسی کام کے لئے بھی دفتر سے کاغذ نہیں دیا جاسکتا کہ وہ غیر ملکی اور پاکستان کے شہری ہوگئے ہیں۔ میں بازار سے کاغذ خریدتا تھا اور سید صاحب کے افاداتِ قلم اور ان کی دوسری چیزیں نقل کرتا تھا جس کا سلسلہ ایک عرصہ تک رہا۔

ایک مرتبہ میں یحییٰ اعظمی صاحب کے گھر ان سے ملنے گیا تو سید صاحب کے گھر کا کچھ فرنیچر ان کے گھر میں نظر آیا، میں نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو بتایا کہ میں نے اس کو خریدا ہے۔ مجھ کو اس وقت تک علم نہیں تھا کہ ان کا اثاثہ بیچا جا رہا ہے اور لوگ خرید رہے ہیں، مجھ کو معلوم ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر ان کی چیزوں کا کون حاجت مند ہوسکتا تھا۔ میں بھی کچھ سامان خرید لیتا اور اس کو دیکھ کر ان کی یاد تازہ کرتا رہتا۔ افسوس کہ یہ سعادت میری قسمت میں نہیں تھی۔

آخر زندگی میں ان دونوں بزرگوں کے باہمی اختلافات خواہ کتنے ہی منتہی کو پہنچ گئے ہوں لیکن ان دونوں بزرگوں سے خود ماجد صاحب کے تعلقات آخر تک بہت اچھے رہے اور ان دونوں کا یکساں اعتماد ان کو حاصل رہا۔ کبھی کسی میں شاید ہی اختلاف رائے کی نوبت آئی ہو۔ سید صاحب کو ان سے جو تعلق خاطر تھا اور ان پر دارالمصنفین کے معاملات میں جو اعتماد تھا اس کی شہادت میں ''مکتوب سلیمانی'' کی دونوں جلدوں کی ایک ایک سطر پیش کی جاسکتی ہے لیکن مسعود علی ندوی کا جس حد تک اعتماد ان کی اخیر زندگی تک حاصل تھا، اس کا اندازہ سید صاحب کے اس آخری خط کے اِن حواشی سے ہوسکتا ہے جو بطور استغاثہ کے مولانا کو بحیثیت صدر مجلس عاملہ لکھا تھا۔ ان میں سید صاحب جیسے سراپا اخلاق، محبوب ومخلص اور قدرداں دوست کے مقابلہ میں حمایت کا پلہ انہی کی طرف جھکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وظیفہ کے بارے میں برسرِ حق مولانا مسعود علی ہی کو سمجھتے ہیں۔ یہ خطوط اگر ان کی زندگی میں شائع ہوتے اور ان کے حواشی سید صاحب کی نظر سے گذرتے تو شاید پسند نہ کرتے۔ بلکہ کیا عجب ہے ان سے شکایت بھی پیدا ہوجاتی کہ انھوں نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان دونوں بزرگوں سے مولانا دریابادی نے نباہ کیا، لیکن ان کے بعد کے دارالمصنفین کے ذمہ داروں سے جو دارالمصنفین کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں اور اپنی سرگرمیوں سے اسی شان کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں، نہیں نبھ سکی۔ یہاں تک کہ انہیں کے دور میں استعفیٰ دینے پر آمادہ ہوگئے اور اپنا استعفیٰ ان کے پاس بھیج بھی دیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولانا کی زندگی کی آخری کتاب ''معاصرین'' میں ان کے ہر طبقہ زندگی کے مشاہیر میں سے ایک ایک کا ذکر آیا ہے اور ان کی دوستی پر فخر کیا ہے اور نہیں آیا ہے تو دارالمصنفین کے ان ذمہ داروں کا جن سے بڑھ

کر دنیا میں اور کوئی معاصر نہیں تھا۔ ان سے مستقلاً خط و کتابت بھی تھی جس کا موضوع دارالمصنفین یا ''معارف'' تھا سال میں ایک مرتبہ مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے سلسلہ میں ان سے اُن کی ملاقات بھی ہو جاتی تھی، پھر بھی ''معاصرین'' میں ان کا ذکر نہ آنا بہت ہی حیرت انگیز اور افسوس ناک ہے۔

ایک خواب

میں کتب خانہ میں اپنے کمرے میں اپنی میز پر بیٹھا کام کر رہا ہوں کہ شبلی منزل کے پھاٹک کی طرف سے سامنے کی پختہ روش پر مولانا شبلی مرحوم کتب خانہ کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے، اسی وضع و لباس میں جس میں ان کی تصویر کتب خانہ میں آویزاں ہے۔ میں نے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو کتب خانہ میں لیوا جا کر سید صاحب علیہ الرحمہ کی میز پر بیٹھا دیا اور میں پھر اپنے کمرے میں چلا آیا پھر وہ سید صاحب کے ہال سے نکل کر میری طرف آتے دکھائی دیئے اور مجھ سے فرمایا کہ میں نے تو کتب خانہ دیکھ لیا، اب رفقاء سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے ان کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے کمرے میں لیوا گیا اور ان کا مختصر تعارف کرایا، اسی کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور میرا یہ لذیذ خواب نامکمل رہ گیا، ان کا بے ڈھنگا سفید صافہ، ان کی عباء ان کا تابناک چہرہ جس پر بڑھاپے کا کوئی اثر نہیں تھا۔ ان کے خراماں خراماں چلنے کی ادا سب میری نگاہوں میں چلی جا رہی تھی اور میں ان کو دیکھنے کے لئے ہمہ تن دید بن گیا ع:

روئے گل سیر ندیدم دلبار آخر شد

شیخ حبیب اللہ صاحب

مولانا شبلی یہاں کے اور ممتاز و معزز و سر برآوردہ خاندانوں کے مقابلہ میں ایک نو مسلم مگر ممتاز و باعزت خاندان سے نسبی تعلق رکھتے تھے، جس کے مورثِ اعلیٰ شیوراج سنگھ تھے جو راجپوت یاراوت تھے، جو آج سے چار سو برس پہلے مسلمان ہو گئے تھے، جن کے مسلمان ہونے کی خاندانی روایت یہ ہے کہ وہ ایک روز شدید گرمی کے موسم میں صبح کو نہار منھ اپنے علاقہ زمینداری پر کسی ضرورت سے گئے، وہاں سے کئی میل کی مسافت طے کر کے گھر دوپہر میں پہنچے۔ بھوک پیاس سے بے تاب تھے، بغیر جوتے اتارے ہوئے چوکے میں چلے گئے، جہاں ان کی بھاوج ان کا انتظار کر رہی تھیں، انھوں نے جوتے پہنے ہوئے چوکے میں داخل ہوتے ہوئے ان کو دیکھا تو بولیں کیا تم نرے ترک ہی ہو گئے کہ جوتے پہنے ہوئے چوکے میں چلے آئے۔

ختم شد

مولانا ابوعلی اثری کے متعلق مشاہیر کی رائے

ابوعلی اعظمی مرحوم کے مضامین اس بزم شبلی کی آرائش میں نور بخشی کے لئے بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں تفکری عناصر بھی ہیں اور تعلقی مباحث بھی کارفرما ہیں، ان کے سادہ اور پرسوز لہجہ نے اردو اسالیب میں خوشگوار علمی متانت کا اضافہ کیا ہے۔ اس دور کے عصری اور عبقری ذہنوں کو بے پردہ دیدنی کے لئے خاصا اچھا مواد سامنے آیا ہے۔

پروفیسر عبدالحق

دہلی یونیورسٹی، دہلی

مولوی ابوعلی اثری صاحب کی مضمون نگاری کی خالص عمر نصف سے زاید عرصہ پر محیط ہے، اس طویل مدت میں انھوں نے مختلف النوع موضوعات پر بلا مبالغہ ہزاروں صفحات لکھے ہیں، جو برصغیر پاک و ہند کے معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ راقم نے جب قلم پکڑنا سیکھا تو ادبی وصحافی دنیا میں مولوی صاحب کے مضامین کی دھوم برپا تھی، ملک کے مشاہیر اہل علم وادب مرحوم کی تحریروں کے مداح اور ان کے قدرشناس تھے۔

محمد نعیم صدیقی ندوی

یہ شخصیت میرے خیالی پیکر سے کہیں زیادہ پرکشش، دلکش، اور دلنواز تھی، ان کی میز پر ایک دوساعت بیٹھنے کی تمنا کتب خانہ کے ہر فرد کے دل میں رہتی تھی۔ مولوی صاحب کے غزل

نما مزاج کو ذرا چھیڑا جائے کہ عمر رفتہ کو آواز دینے میں دیر نہ رہے، پھر ان کا ساز چھڑتا اور جب لے بلند ہوتی تو سننے والا سرشار ہو جاتا علامہ شبلی سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن تک دارالمصنفین کی وہ مجسم داستان ہو جاتے، اکثر کیف کے عالم میں کہتے کہ دارالمصنفین کا سب سے قدیم خدمت گار ہی نہیں اس کی تاریخ بھی ہوں۔

عمیر الصدیق ندوی

مولانا ابو علی اثر کا دام ظلہٗ ایک صاحب علم و فضل بزرگ ہیں مولانا موصوف کو تراجم و سیر کا خاص ذوق ہے۔ چنانچہ کئی اہل حدیث اکابر اور بزرگوں کے تذکرے ان کے قلم سے ''الاعتصام'' کی ابتدائی فائلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف

رکن مجلس ادارت ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور

دنیا میں بہتیرے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذات سے دوسروں کو فیض پہنچایا ہے دوسروں کو بام شہرت پر بٹھایا ہے اور خود گوشۂ گمنامی میں زندگی گذاری مولانا ان ہی لوگوں میں سے ایک ہیں سے ایک ہیں جو ایک طویل مدت سے دارالمصنفین کے شعبۂ تصحیح میں کام کر رہے ہیں اور اگر آپ جناب موصوف سے بغیر ملے واپس آگئے، تو سمجھئے کہ آپ نے بہت بڑی بھول کی۔ آپ ان سے ضرور ملیے، ان کی ذات میں آپ کو رسمی تکلفات اور خلوص کے ساتھ ایک جیتا جاگتا نمونہ ملے گا، وہ ایک خاص طرز نگارش کے مالک ہیں۔ بہت ہی پاکیزہ اور ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر شعیب اعظمی

مولانا خود صاحب ذوق ہیں اور شبلی کے طرز تحریر کے اداشناس ہیں، اس لئے دوسروں کے مضامین پر ناقدانہ اصلاح کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ سید صاحب کی تحریروں پر بھی اصلاح سے نہیں

چوکتے تھے اور سید صاحب برانہیں مانتے تھے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی

مولوی عبدالباری صاحب بوٹے قد، سفید پوش، وجود کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ وہ ابوعلی اعظمی، یا اثری کے قلمی نام سے مضمون نگاری کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی کتاب زندگی میں سادگی، بے نفسی، قوت مشاہدہ، سرعت انفعال، انتہا پسندی، جرأت اظہار ذکاوت حس خود داری، واستغنا، خود اعتمادی نستعلیقی نفاست، نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی اس کے جلی ونمایاں عنوانات ہوں گے۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

ہندو پاک کے موقر جریدوں اور اخبارات مثلاً فاران، جامعہ، سب رس، تہذیب الاخلاق، تعمیر حیات، ندائے ملت، صدق جدید، سیاست، مدینہ، قومی آواز، وغیرہ میں آپ کے ہزاروں مضامین شائع ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم نائک
اڈیٹر ماہنامہ نقش کوکن ممبئی

دارالمصنفین کے عروج کا دور دیکھنے والے اب تنہا وہی رہ گئے تھے، وہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے ہم سبق تھے، دارالمصنفین کی وابستگی کی وجہ سے انھیں مضمون نگاری کا چسکا لگ گیا تھا۔ علامہ شبلی کے بڑے مداح اور سید صاحب کے نہایت عقیدت مند تھے۔

اڈیٹر "معارف" اعظم گڑھ

دارالمصنفین کے پرانے کارکنوں میں ہیں اور محترم سید سلیمان ندوی صاحب سے بہت

عقیدت رکھتے ہیں۔ مرحوم بھی مولوی صاحب کو بہت مانتے تھے، جب سید صاحب کا کراچی میں انتقال ہوا تو یہاں خبر سن کر وہ پچھاڑیں کھا کر رو رہے تھے میں انھیں دارالمصنفین سے اپنے گھر لیوا آیا اور بڑی تسلیوں اور دلاسہ کے بعد ان کو چپ کرایا۔

حکیم محمد اسحاق مرحوم

آپ کے مضامین نے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ لکھنؤ میں مجھ سے کئی بڑے آدمیوں نے پوچھا کہ ابوعلی کون صاحب ہیں، میں نے آپ کا پورا تعارف کرادیا ہے۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

وہ علامہ شبلی کے پرستار، عقیدت کیش اور انھیں اردو کا سب سے بڑا انشاپرداز، ادیب اور مصنف سمجھتے ہیں اور خود بھی اقلیم علم وادب کے اسی شہنشاہ کے اسلوب نگارش کا تتبع کرتے ہیں۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

میری ابتدائی تربیت میرے محترم بزرگ مولوی عبدالباری صاحب کی مرہون منت ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہیں اور آستانہ شبلی وسلیمان کی خاک روبی کو اس پیرانہ سالی میں بھی مایۂ امتیاز سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خاصانِ خدا میں ہیں جو اپنی گمنامی کو ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

مولانا ابوعلی اثری کی متعدد تحریریں ”فاران“ میں شائع ہوتی رہتی ہیں اور پڑھنے والوں نے انھیں پسند کیا ہے، جہاں تک ابوعلی صاحب کی تحریر وانشا کا تعلق ہے اس میں بڑا خلوص پایا جاتا ہے۔

ماہر القادری

اڈیٹر ”فاران“ کراچی

مولانا عبدالباری کی ذہانت وفطانت کا خاصہ ذکر کبیر احمد جائسی کرتے، ان کی علمی لیاقت کا خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اپنی ایک کتاب کا ان کے نام انتساب بھی کیا۔ مولانا اگرچہ دارالمصنفین میں مصحح تھے لیکن حقیقتاً وہ عالم رمزشناس اور ادب نواز تھے۔ جن کی شخصیت نے نہ جانے کتنوں کو متاثر کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی بھی اس بڑے انسان سے متاثر تھے۔ سید صاحب ان سے استفادہ کرتے تھے، بہت سے علمی مباحث میں ان سے رجوع کرتے اور تصحیح کے وقت وہ ان کے مضامین کی بھی اصلاح کرتے تھے اور اس پر سید صاحب کبھی ناگواری کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ناگواری کا اظہار تو کم ظرف کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

آپ نے مولوی عبدالباری صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع کرکے اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے، افسوس ہے تو اس بات کا کہ مولوی صاحب کے مداحوں کی فہرست سے میرا نام غائب ہے۔ میں نے ان کی شخصیت اور حالات پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا جو جون ۱۹۸۸ء کے ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوا تھا، پھر اسی مضمون کا ترجمہ ہندی رسالہ ''نشانت'' میں شائع کروایا تھا۔ مرحوم نے میرے مضمون کو بہت پسند کیا تھا اور اس کو اس کتاب کا مقدمہ بنالیا تھا جو مولانا آزاد پر تھی اور ضیاء اللہ کھوکھر کو بھیجی گئی تھی۔ مولوی صاحب کے اسی مکتوب نگاری پر آپ کا مضمون نظر سے گذرا، میرے پاس بھی ان کے بہت سے خطوط ہیں جن میں دارالمصنفین کا کچا چٹھا بھی ہے، اگر میرے اور آپ کے نام لکھے خطوط یکجا کردیئے جائیں تو ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ میں نے ان کا ایک ایک خط محفوظ رکھا ہے۔ جہاں تک مولوی عبدالباری صاحب کے مجموعہ مضامین کا سوال ہے اس پر کیا رائے دوں، ان میں سے بہت سے مضمون تو میں نے ''ادیب''، ''کانفرنس گزٹ'' اور ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کیے تھے۔ ان کے اسلوب نگارش کے مداح تو سب ہی ہیں صرف اتنا ہے کہ انھوں نے حوالوں کا التزام نہیں کیا ہے، ورنہ اور زیادہ علمی شمار ہوتے۔

کبیر احمد جائسی

''حج بیت اللہ شریف''

(مصنف ارشد علی انصاری اعظمی)

کے متعلق مشاہیر وعام قاری کے تاثرات

(۱) ''الرشاد'' اعظم گڑھ

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم پاسباں ہیں اس کے وہ پاسباں ہمارا

ماشاء اللہ مصنف کتاب ارشد علی انصاری اعظمی بھی حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، ان کا ولولہ وشوق اور کیفیت وذوق کتاب کے ہر لفظ میں چھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ارشد علی صاحب ۔ نے اس مختصر سے کتابچے میں مقامات مقدسہ کی ایسی دلکش تصویر کشی کی ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار وجد میں جھوم اٹھتا ہے اور زبان حال سے یہ گنگناتا ہے ع

حرم میں اُڑ کر جا پہنچوں اگر اللہ دے دے پر

مولانا ریاض عبد الرحمٰن قاسمی استاد جامعۃ الرشاد کے نزدیک تو یہ کتاب کیا ہے گویا ''عروس رُخ زیبا در خلعت اطلس و دیبا'' کا حسین ترین مرقع ہے، زائرین حرم کے لئے بالخصوص یہ ایک نادر تحفہ ہے ہمیں یقین ہے کہ ہر خاص و عام میں اس کتاب کا اس کے شایان شان استقبال کیا جائے گا اور ہر شخص اس سے فائدہ حاصل کرے گا۔ مصنف کتاب کے سعی سعود کی یہی قدر دانی ہوگی۔

(٢) خطیب الرحمٰن ندوی جامعہ اسلامیہ مظفر پور ضلع اعظم گڑھ یوپی۔

ہر مسلمان کی خواہش اور دعا ہوتی ہے کہ حج بیت اللہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت سے چشم و دل کو نور و سرور کی نعمت ملے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے مسلمان بہ توفیق الٰہی سفر کر کے مکہ ومدینہ (زادھما اللہ شرفا) کا قصد کرتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جو اس سفر سعادت کی روداد قلم بند کر لیتے ہیں تا کہ بعد میں بھی پر کیف یادوں سے اپنے وجدان واحساسات کو شاد کام کرتے رہیں اور دوسروں کو بھی اس لطف ولذت میں شریک کر لیں۔ ارشد علی انصاری صاحب اپنے جذبات وتشکر وامتنان کو بلا تکلف وتصنع سادہ زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے یہ ایک روزنامچہ ہے جس میں ابتدائے سفر ۲۳؍دسمبر ۲۰۰۵ سے ۷؍فروری ۲۰۰۶ء تک کی یومیہ روداد سپرد قلم کی گئی ہے، اس میں اختصار کے ساتھ حج کے لوازمات اس کے فرائض، واجبات وسنن کے ساتھ پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی اور تہجد کے اہتمام کا ذکر کیا گیا ہے، تاہم اس سادگی کے باوجود قاری اثر کیفیت اور کشش ضرور محسوس کرے گا اور یہی کسی تحریر کی اصل شان ہے۔

(٣) جناب عین الحق قاسمی۔ خیرآباد (مئو)

انصاری صاحب اپنے والد محترم جناب مولانا عبدالباری (ابوعلی اثری) کی طرح پڑھنے لکھنے کے شوقین اور تعلیمی ذہن کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے سفر حج کے حالات بڑے شوق سے قلم بند کیے ہیں، انداز بہت ہی سادہ ہے، یہ ایک مخلصانہ کوشش ہے جس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ کتاب کی طباعت عمدہ، سرورق جاذب نظر ہے، اس کی قدر وقیمت کا اندازہ باذوق قارئین اس کے مطالعہ سے خود کر سکتے ہیں۔

(٤) محمد جسیم الدین ''راشٹریہ سہارا''، لکھنؤ

حج بیت اللہ شریف ارشد علی انصاری اعظمی کا سفرنامہ حج ہے۔ حج بظاہر سفر کی ایک شکل

ہے لیکن اپنی نوعیت میں کیسا انوکھا ومنفرد ہے کہ ہزاروں سال سے چہار دانگ عالم سے بغیر کسی رنگ ونسل کے اختلاف کے یکساں لباس میں ملبوس ہوکر فرزند توحید مناسک حج کی ادائیگی کرتے ہیں، یہ منظر کتنا دلفریب اور روح پرور ہوتا ہے، اسی کی رعنائی ودلکشی کو ارشد علی انصاری اعظمی نے اپنے انداز میں بیان کیا ہے ساتھ ہی انھوں نے حج کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے حج کے مقاصد وفوائد علماء کی آراء سے اپنے سفرنامہ حج کو زینت بخشی ہے، متبرک مقامات کی زیارت کے عنوان سے مسجد قبا، مسجد قبلتین، مقام غزوہ بدر، مقام غزوہ خندق، قبر حضرت حمزہؓ، جنت البقیع، جنت کی کیاری اور صفہ وغیرہ کے مناظر کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ منیٰ، میدان عرفات، مزدلفہ، جمرۂ عقبہ، ودیگر ارکان حج کی ادائیگی کے دوران اپنے تاثرات کو بہت ہی سہل الفاظ میں بیان کیا ہے، اس مقدس سرزمین کے حدود میں ایمانداری واعتبار کو بیان کرتے ہوئے اعظمی صاحب نے لکھا ہے: ''اگر ایمانداری اعتبار اور نیک نیتی کا معاملہ دیکھنا ہوتو حرم کے حدود کی دوکانوں کو دیکھا جائے جہاں دکان کا ہر سامان بغیر کسی خاص نگہبانی کے رکھا رہتا ہے، بڑی سے بڑی دکان ہو سپر مارکیٹ ہو آپ کی جو سامان پسند ہو اٹھالیں اور کاؤنٹر پر لے جاکر رکھ دیں، کاؤنٹر کلرک قیمت وصول کرے گا اور رسید دے گا۔ ایمانداری اور اعتبار کا عالم یہ ہے کہ دکانوں پر سامان رکھا ہوا ہے آپ کو جو سامان لینا ہو اور سامان پسند کرنے میں اگر تاخیر بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں آپ کو کوئی نہیں ٹوکے گا، خوب دیکھ بھال کر سامان اٹھایئے اور اپنے تھیلے میں رکھئے، دوکاندار کو سامان دکھا کر قیمت ادا کر دیجئے۔

(۵) محمد عمیر الصدیق ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ

اس حج کا مسافر ایک ایسی شخصیت کا فرزند ہے جس کی عبارت اور تحریر کو اہل نظر سے مسلسل داد ملتی رہی کہ ان کی تحریر سلاست روانی اور شگفتگی سے عبارت تھی، میراث میں یہی دولت جناب ارشد علی انصاری کو ملی۔ حج کی سعادت ان کے والد بزرگوار جناب عبدالباری صاحب معروف بہ ابوعلی اثری مرحوم کو نہ ملی، ہمہ شوق کے ہمہ حرماں بن جانے کی وہ مثال تھے کیا عجب کہ

عالم ارواح میں اپنے بیٹے کی اس خوش بختی پر وہ نازاں ہوں اور پسر تمام کند کی عملی تشریح سے فرحاں ہوں۔ یہ یقین ہے کہ یہ مختصر سا سفرنامہ حج ارشد صاحب کے نامہ اعمال کو قبولیت بخشے گا اور پڑھنے والوں میں بھی مقبولیت حاصل کرے گا۔

(۶) بلال احمد القاسمی محلہ کاستھ ٹولہ محمد آباد گوہنہ

آپ کی ہدیہ کردہ کتاب "حج بیت اللہ شریف" میں نے پڑھی۔ یوں تو حج بیت اللہ شریف کے لئے بہت لوگ تشریف لے جاتے ہیں، لیکن بہت ہی کم حضرات اپنے احساسات وجذبات کو قلم بند فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو توفیق عطا فرمائی کہ آپ نے اپنے احساسات وجذبات کو اس پاک سرزمین کے متبرک مقامات کی زیارت کر کے لوگوں کے ذہنوں کو تر و تازہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ آپ کی اس سعی کو مقبولیت سے نوازے، آپ نے اپنے چاہنے والوں کا تذکرہ کر کے ان کے دلوں کو خوشی بخشی۔

(۷) نظام الدین صاحب محلہ دکھن ٹولہ خیر آباد (مئو)

حج بیت اللہ شریف کو پڑھا اور کئی مرتبہ پڑھا واللہ دل باغ باغ ہو گیا، کتاب کیا ہے عروس جمیل درلباس حریر کی مصداق، انبساط روح اور فرحت نظر کے ساتھ تسکین ذوق کا سامان بھی، اس میں موجود ہے، تحریر میں بڑی شگفتگی اور دلکشی ہے۔

(۸) پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری

ہمیں امید ہے کہ آپ کی یہ کتاب لائبریری میں آنے والے اسکالرز اور ریڈرس کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

(۹) روزنامہ وارث اودھ مئو

یہ سفر تو بس صرف تعمیل کا ہے آواز سنی تو لبیک کہنا ہی ہے دیوانہ وار زبان پر اپنی بندگی کے

ہر احساس کو زندہ کر کے صرف ایک نعرہ مستانہ لاتا ہے کہ اے آقا، اے مالک، اے بندہ نواز میں تو تیری چوکھٹ پر آ کھڑا ہوں یہ چوکھٹ طور نہیں اس لئے تیرے دید کی طلب کی ہمت بھی نہیں ہاں زبان ودل کی دنیا اس یقین سے ضرور آباد ہے کہ یہ آقا کا گھر ہے، آقا کی مہربانی جب انتہا کو پہنچی تو یہ میزبانی میں بدل گئی، جس سادہ انداز بیان میں سفرحج کی روداد بیان کی گئی ہے وہ قابل تحسین ہے، اس کتاب میں مصنف نے سفر کی شروعات سے واپسی تک کے لمحات کی جس طرح شیرازہ بندی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ارشد علی انصاری کی نثر نگاری اپنے والد مولانا عبدالباری ابوعلی اثری سے ورثہ میں ملی ہے، انھوں نے اس کتاب کو اس انداز میں ترتیب دیا ہے کہ دوسرے عازمین حج کو اس سے کافی مدد مل سکتی ہے، انھوں نے اپنے سفر حج کے دوران اپنی ان قلبی کیفیات کو قلم بند کرنے کی کوششیں کی ہے جو سفر حج کے دوران انھوں نے محسوس کی، انھوں نے حج کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے اور اس کیفیت کا بھی ذکر کیا ہے جو لاکھوں فرزندان توحید کے اجتماع اور ان کی جانب سے بلند کی جانے والے صدائے لبیک پر محسوس ہوتی ہے۔اس کتاب میں جو ابواب قائم کئے ہیں اور مناسک حج کے بارے میں جو تفصیلی روشنی ڈالی ہے وہ اتنی سلیس زبان اور ستھرے انداز بیان پر مبنی ہے کہ عام آدمی بھی اسے پڑھ کر اس سے استفادہ کر سکتا ہے، خاص طور پر عازمین حج کے لئے یہ کتاب کافی مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

(۱۰) عظمت علی قاسمی معلم دینیات ای بی ٹی ہائی اسکول ٹھاکرواڑی دیوگڈھ سیندھودرگ مہاراشٹر۔

حج بیت اللہ شریف حاجیوں کے لئے مشعل راہ ہے خانہ خدا میں روح پرور فضا کے سایہ تلے ایمان ویقین کی پاکیزگی کس طرح حاصل ہو، خدا کے بے شمار انعامات ومغفرت کے سدابہار موسم میں کیسے پروانہ وار دیوانہ ہو کر مقدس مقامات کی زیارت کرے۔عبادت وریاضت کی کرم گستری سے لوگوں کو خشوع وخضوع کس طرح نصیب ہو، جذبہ عبودیت کے نکھرے یہ کتاب ان کے لئے نایاب تحفہ حسین سنگم اور دلنشیں گلدستہ ہے۔

(۱۱) ہیڈ ماسٹر ابراہیم بابا ٹھاکر ہائی اسکول ٹھاکرواڑی تعلقہ دیوگڑھ ڈسٹرکٹ سیندھودرگ

کتاب کافی پسند آئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حج جیسے اہم فریضہ کو ادا کرنے کی سعادت بخشی اور آپ نے مقدس سرزمین کی خوشگوار یادوں اور روح پرور نظاروں کو کتاب کی شکل میں سمیٹ کر عام شائقین کو ایک نایاب تحفہ دیا ہے۔ انداز بیان اتنا دلنشیں ہے کہ دل ودماغ کے تاریک گوشے منور ہوجاتے ہیں اور لب پہ یہ دعا آجاتی ہے ؎

دکھادے یا الٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولیٰ تری رحمت برستی ہے

اللہ تعالیٰ آپ کے عزائم اور حوصلوں میں وہ جوش اور روانی عطا کرے کہ آپ تادیر پرورش لوح وقلم کرتے رہیں۔

(۱۲) رضوان دانش خیرآباد مئو، متعلم دارالعلوم دیوبند

جب میں نے تراویح پڑھانے کے لئے کسی مسجد کے بارے میں غور کیا تو سب سے پہلے وہ مسجد میرے ذہن میں آئی جس میں آپ برابر پنجوقتہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور امام صاحب کی غیر موجودگی میں آپ ہی امامت بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صالح زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام برادران اسلام کو حج مبرور کی سعادت سے بہرہ ورفرمائے۔ آمین

(۱۳) باب الاسلام، ماہنامہ ممبئی

حج کا سفرنامہ چونکہ روح کی بالیدگی، ایمان کی حرارت اور عمل صالح کی جوت جگاتا ہے اسی لئے اس سفرنامہ کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ حج بیت اللہ شریف کے نام سے ارشد علی انصاری اعظمی صاحب کا یہ سفرنامہ بھی اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے، ہر ہر لفظ سادگی، حقیقت پسندی، والہانہ تڑپ اور نیازمندی کا عکاس ہے خصوصاً متبرک مقامات کے زیارت کی منظر کشی بڑے ہی خوبصورت انداز اور دلکش پیرائے میں کی گئی ہے، پرانی یادوں اور نئے احوال سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے، مثلاً مقام غزوہ خندق کا تذکرہ کرتے ہوئے جہاں اس کے پائے جانے کی خبر ہے وہیں اس

مقام پر مساجد خمسہ بلکہ مساجد ستہ (مسجد فتح، مسجد سلمان فارسیؓ، مسجد ابوبکر صدیقؓ، مسجد عمرؓ، مسجد علیؓ اور مسجد فاطمہؓ) کی تعمیر کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے، بحیثیت مجموعی یہ سفرنامہ عمدہ معلومات کا خزانہ، اور نئے حاجیوں کے لئے بہترین گائیڈ ہے۔ حج سے متعلق آیات، احادیث اور حج کے مقاصد اور فوائد پر اکابر علماء کی تحریروں نے اس کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیا ہے۔ ☆

☆☆☆

ایک تاثر

کتابچہ ''حج بیت اللہ شریف'' اعظم گڑھ کے مشہور انشا پرداز ابو علی اثری (مولوی عبدالباری) کے ثمر حیات جناب ارشد علی انصاری اعظمی کا ۸۰ صفحات پر مشتمل حج نامہ ہے۔ لیکن حج سے متعلق موضوعات وعنوانات ۶۲ صفحات کو محیط ہیں بقیہ ۱۸ صفحے ابو علی اثری کی تالیف ''علامہ شبلی اور مولانا آزاد'' مرتبہ وشائع کردہ ارشد علی انصاری اعظمی پر اہل علم ونظر اور قارئین کے تاثرات کے اقتباسات کے لئے وقف کیے گئے ہیں۔

دراصل یہ مختصر حج نامہ لکھنے والے کے مزاج ورجحانات، ذوق وشوق، اولیات وترجیحات اور دید ودانش کا تعارف نامہ ہے جس سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کافی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اردو زبان ہی میں نہیں مسلمانان عالم کے معاشرے میں رائج ان تمام زبانوں میں بے شمار سفر نامہ حج لکھے گئے ہیں جنہیں وہ علمی وادبی، قومی وملی، تمدنی ومعاشرتی اظہار خیال کے لئے شان قرطاس وقلم جانتے ہیں۔ ان تمام کا موضوع اور غرض وغایت ایک ہی ہے لیکن اظہار یے سب کے الگ الگ اور مصنف کی شخصیت کی چھاپ لیے ہوئے۔ جذبات عشق ومستی کی کیفیت کی یکسانیت کے باوجود تاثرات کا بیانیہ کم وکیف کے اعتبار سے مختلف نوعیت اور رنگ وآہنگ کو ظاہر کرنے والا ہے۔ احساس بندگی، وآماندگی وورماندگی، عجز وانکساری، خود سپردگی، وخود فراموشی ہی سے حقیقی معرفت کی دولت بیدار ہاتھ آتی ہے۔ عالم رنگ وبو میں گم اپنی ذات کی تلاش وکائنات شناسی کے بند دروازوں کو کھولنے میں مدد ملتی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس کے لئے زبان وبیان کی شگفتگی، ادب وانشا کی رعنائی، حسن کلام کی جمالیات، رفعت خیال، بلند ذوقی وخوش آہنگی، نکتہ رسی وباریک بینی کی

ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف جان پر سوز کام دیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں خموشی گفتگو اور آنسوؤں کی روانی مجسم دعا بن جایا کرتی ہے۔

ارشد علی نے حج کی داستاں سرائی اور سفر کی روداد نگاری میں حج کی درخواست گزاری سے اپنے رہائشی آشیانے میں واپسی تک کے پیش آمدہ تمام واقعات و سانحات کی جزئیات کو کافی اہمیت دی ہے۔

حج و زیارت کا یہ مختصر کوائف نامہ اپنے انداز ترتیب کے اعتبار سے دراصل ایک ڈائری یا روز نامچہ ہے جس میں سلسلہ وار وقوع مندرج کیے گئے ہیں۔ اس اہتمام تحریر نے اس کو اپنی سوانح حیات کے ایک باب کی صورت اختیار کر لینے کی سبیل بھی پیدا کر دی ہے۔ ۸ جون ۲۰۰۵ سے ۷ فروری ۲۰۰۶ تک کے اس سفر شوق میں قدم بہ قدم، مرحلہ در مرحلہ، منزل بہ منزل جن شدائد و مشکلات اور نشاط و کیف کے کھٹے میٹھے تجربات و مشاہدات کی دھوپ چھاؤں سے زائر کو گزرنا پڑا ہے انھوں نے سادگی کے ساتھ نہایت معصومانہ انداز میں کسی طرح کی عبارت آرائی و مبالغہ آمیزی سے گریز کرتے ہوئے بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا ہے۔ لیکن ایجاز و اجمال کا جذبہ اشہب قلم کو اس قدر اپنے اثر میں رکھے ہوئے ہے کہ کسی کسی مقام پر شدید تشنگی کا احساس ہوتا ہے اور یہ مختصر نویسی کھلنے لگتی ہے۔ کاش کہ موقعے کی مناسبت اور مقام و مضمون کے اقتضا کو سمجھتے ہوئے اک ذرا دیر کے لئے ضعف خامہ اور صفحے کی تنگ دامانی سے صرف نظر کر لیا گیا ہوتا تو لکھنے والے سے محرومی کی شکایت نہ ہوتی اور قاری کے علم و خبر میں کچھ اور مفید اضافہ ہو جاتا۔ پہلی بار مسجد حرام میں داخلے کی خواب ناک تحیر زائی، اطراف کعبہ کی شاندار فلک بوس عمارتوں کی تصویر کشی، موجودہ عمارتی شان و شکوہ کے ظاہری حسن و جمال کو دیکھ کر تصورات کے پروں پر اڑتے ہوئے ماضی کی طرف مراجعت کا بیانیہ ملاحظہ ہو:

> ''اتنی خوبصورت، جاذب نظر، ہوش ربا، روشن، شاندار، لمبی چوڑی، کشادہ مسجد ہم نے آج پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس مسجد اور یہاں کی عمارتوں کو دیکھنے کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مکہ معظمہ میں غریب اور پریشان حال لوگ کبھی رہے ہوں گے۔ رسول مقبول صلی

اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے آج تک کی تبدیلی زمین و آسمان کے فرق کے برابر ہے۔
خدا کے فضل و کرم سے ہر چہار طرف برکت ہی برکت ہے۔ ہم نے مسجد کے اندر داخل
ہوتے ہی لَبَّیکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیکَ پڑھنا شروع کیا۔ کعبہ شریف چونکہ صحن سے کافی
اونچائی پر ہے اس لیے مسجد کے ہر چہار طرف سے دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا تھا صفا و
مروہ پہاڑ ہیں اور پہاڑ کی صورت میں ہوں گے لیکن وہاں تو بہت خوبصورت، شاندار،
صاف شفاف کشادہ ہال ہے اور دو منزلہ ہے۔ گزرے زمانے کی کوئی جھلک نظر نہیں
آئی۔"

حج زندگی بھر کے نالۂ نیم شبی اور دعائے سحر گاہی کا صلہ، فغان درویش پر مالک حقیقی کا التفات کرم، اپنی حقیقت کے اعتبار سے سراسر ایک روحانی سفر، تزکیٔ نفس کا بہترین ذریعہ، معراج سرمستی ور بودگی کمال جذب وشکر، اہتزاز قلب و روح کا سامان، عبودیت و بندگی کی سرشاری، عشق و خود فراموشی کا انعام، آشفتگی و خود سپردگی کی دولت لازوال کی تحصیل سے عبارت ہے۔ کعبہ شریف پر پہلی نظر کی لذت و کیفیت کیا ہوتی ہے اس کو ایک عاشق صادق ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن حج بیت اللہ شریف کے حروف و سطور کا آبگینہ اس نگاہ اولیں کی مئے دو آتشہ سے خالی ہے۔ اقتباس کی عبارت بتا رہی ہے کہ نظر فریب رنگ و بو کا صید زبوں بن کر لفظوں کے فتراک میں بند ہو چکی ہے۔ کعبۃ اللہ شریف کے پہلی مرتبہ دیدار کی لذت و سعادت حاصل عمر گریزاں ہوتی ہے۔ دل جذبات و کیفیات کی لہروں سے بے قرار و سیماب وش ہو جاتا ہے، ان ہی روحانی لہروں کی تجسیم یا صورت گری کا سفر نامہ حج کا مرکزی عنوان و اساس تحریر ہونی چاہیے۔ اسی عنصر سے قاری کی آتش ذوق و شوق بھڑکتی ہے اور ملت براہیمی سے مربوط ہونے کی تمنا جاگتی ہے۔ یہاں ایک روح پرور اقتباس پیش کیا جاتا ہے:۔

مسجد حرام کا پورا صحن، چھت، برآمدہ اور مسجد کے باہر کا لمبا چوڑا صحن حجاج سے بھر جاتا
ہے۔.......... پوری سڑک مع فٹ پاتھ نمازیوں سے پر ہو جاتی ہے۔ دنیا کے ہر ملک
سے حاجی تشریف لائے ہیں.......... ہر ملک کا حاجی مکہ معظمہ میں دیوانگی کے

عالم میں آتا ہے اور چوبیس گھنٹہ عبادت وریاضت میں گزاردیتا ہے۔ اللہ اور رسول کے علاوہ اس سرزمین پر کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لہولعب اور موسیقی کی جگہ ہر چہار طرف کیسٹ سے کلام پاک کی آیتیں اور سورہ سن کر حاجی دم بخود رہتا ہے۔ دنیا اس کو حقیر نظر آتی ہے اور آخرت کی یاد میں ہمہ وقت مشغول رہتا ہے۔"

لیکن اس مقدس سرزمین پر جہاں عقیدت سے فرشتے پر اور دیوانے دل بچھاتے ہیں زائر حرم کو بعض افسوس ناک صورت حال پر خون کے آنسو رونے پڑے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ: "مسجد حرام کی چھت پر میں نے حاجیوں کو جوتا اور چپل پہن کر چلتے ہوئے دیکھا جو نہایت معیوب اور بے ادبی ہے۔"

جیب کترنے والوں کی حرکات شنیع پر ان کے تاثرات ان لفظوں میں ہیں: "اگر یہاں خوف خدا نہیں ہے تو دنیا کے دوسرے مقامات پر مجرم نڈر ہو کر جرم کرسکتا ہے"۔ حج مختلف تہذیبوں کو سمجھنے، اسلامی اخوت و مساوات کی قدروں سے استفادہ کرنے اور اقوام عالم کے درمیان تمام جغرافیائی وقبائلی اور نسلی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر امتزاجی وارتباطی رنگ وآہنگ کو پھیلانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ نئے نئے تجربات ومشاہدات سے علم وخبر کے کشکول میں گراں مایہ لعل وگہر کا اضافہ ہوتا ہے۔ ارشد علی انصاری نے بھی ایک مشاہدے سے اپنی بیاض زندگی میں روشنی کی یہ لکیر بڑھائی ہے کہ: "میں سمجھتا تھا کہ ہندوستان کے لوگ ہی نماز کے بہت پابند ہیں لیکن یہاں تو ہر ملک کے حاجی جوق در جوق نماز باجماعت پڑھنے کے لئے ذوق وشوق کے ساتھ مسجد حرام میں جگہ تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتیں نماز اور عبادت کے لئے بے تاب نظر آتی ہیں: ایک مقام پر ان کا تاثر یہ ہے کہ: "یہاں کی پاک سرزمین میں اگر کوئی چیز غائب ہو جائے تو اس کو غائب نہیں ماننا چاہیے بلکہ اس کا بدل ملنے میں دیر نہیں لگتی اور آج میرے ساتھ بھی یہی ہوا: انھوں نے خیر القرون کے امانت وبے نیازی کے سبق کو موجودہ زمانے میں آموختہ کی طرح یاد رکھنے کا یہ پہلو بھی دکھایا ہے: اگر ایمانداری، اعتبار اور نیک نیتی کا معاملہ دیکھنا ہو تو حرم کے حدود کی دکانوں کو دیکھا جائے جہاں دکان کا ہر سامان بغیر کسی نگہبان کے رکھا جاتا ہے .... آپ کو جو سامان لینا ہو اور سامان پسند کرنے میں اگر دیر بھی ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں آپ کو کوئی ٹوکے گا نہیں۔ خوب دیکھ

بھال کر سامان اٹھایئے، اپنے تھیلے میں رکھیے اور دکاندار کو سامان دکھا کر قیمت ادا کر دیجئے وہ آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ان کے علاوہ اور کوئی سامان تو آپ نے نہیں لیا ہے:

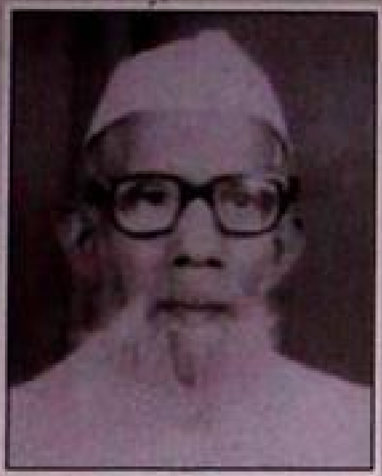
مکہ اور جوار بیت الحرام کے بعد اب مدینہ کی گلیوں میں ان کے کھو جانے کے پس منظر میں تصورات کی خلد طربناک اور محبت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم بھی دیکھئے"

لیکن اس تمام دوڑ دھوپ، پریشانی اور گھبراہٹ کے باوجود میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ انھیں گلیوں میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بار بار پڑے ہوں گے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ راستہ بھول جانے کی وجہ سے ان گلیوں میں میرا گزر ہوا۔"

روداد سفر بیان کرنے میں سعودی انتظامیہ کی فراہم کردہ مراعات و سہولیات، صفائی ستھرائی، روشنی، لمبی چوڑی سڑک، ایرپورٹ، پاسپورٹ، شناختی کارڈ، بلڈنگ، بس، خیمہ نمبر، رمی کے حادثے، مختلف سنین میں حادثہ رمی کے مہلوکین کی تعداد مع صراحت ممالک، علاج معالجہ، اسپتال، دعوت و مدارات، کسٹم، لفٹ وغیرہ کے بارے میں مختصر الفاظ میں ظاہری چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس طرح کی عمومی چیزوں کا ذکر لطف لے لے کر کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر صفحے پر نماز با جماعت، تہجد گزاری، تلاوت کلام اللہ شریف، ملاقاتیوں وغیرہ کا بھی ذکر مذکور ہے۔ انھوں زیارتوں کے تعلق سے بعض اہم باتیں کہیں اور تاریخ کے اوراق الٹے ہیں۔ کہیں کہیں مسائل و مکروہات روزگار، ناگہانی آفات اور فرائض و واجبات کی ادائیگی میں حائل ہونے والے امکانی حالات کے تدارک و تصفیہ کی تدبیریں بھی بتائیں۔ انھوں نے واردات و کیفیات ذہنی و قلبی کا ذکر واذکار کم کیا ہے، اپنے نجی معاملات یعنی اپنی ذات کا اظہار زیادہ کیا ہے۔ قریب قریب ہر صفحے پر مفعول مونث کا فعل تذکیری صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جیسے انھوں نے دوا لگا کر ڈریسنگ کر دیا۔ ہم نے امیگریشن جانچ کرایا۔ ضروری باتیں بتائیں اور ہدایت کیا۔ کشادہ مسجد ہم نے آج پہلی مرتبہ دیکھا وغیرہ۔

قمر الزماں مبارک پوری

۴ر اپریل ۲۰۲۰ء سنیچر



مولانا ابوعلی اثری کے متعلق مشاہیر کی رائے

میری ابتدائی تربیت میرے محترم بزرگ مولوی عبدالباری صاحب کی مرہون منت ہے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہیں اور آستانہ شبلی وسلیمان کی خاک روبی کو اس پیرانہ سالی میں بھی مایۂ امتیاز سمجھتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ان خاصانِ خدا میں ہیں جو اپنی گمنامی کو ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

مولانا خود صاحب ذوق ہیں اور شبلی کے طرز تحریر کے اداشناس ہیں، اس لیے دوسروں کے مضامین پر ناقدانہ اصلاح کرتے ہیں حتی کہ وہ سید صاحب کی تحریروں پر بھی اصلاح سے نہیں چوکتے تھے اور سید صاحب برا نہیں مانتے تھے۔ (مولانا مجیب اللہ ندوی)

مولوی عبدالباری صاحب پست قد، سفید پوش، وجود کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ وہ ابوعلی اعظمی، یا اثری کے قلمی نام سے مضمون نگاری کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی کتاب زندگی میں سادگی، بے نفسی، قوت مشاہدہ، سرعت انفعال، انتہا پسندی، جرأت اظہار ذکاوتِ حس خودداری، واستغنا، خوداعتماد نستعلیقی نفاست، نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی اس کے جلی ونمایاں عنوانات ہوں گے۔

(ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی)

مولانا ابوعلی اثری دام ظلہ، ایک صاحب علم وفضل بزرگ ہیں مولانا موصوف کو تراجم وسیر کا خاص ذوق ہے۔ چنانچہ کئی اہل حدیث اکابر اور بزرگوں کے تذکرے ان کے قلم سے ''الاعتصام'' کی ابتدائی فائلوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ (حافظ صلاح الدین یوسف / رکن مجلس ادارت ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور)

ابوعلی اعظمی مرحوم کے مضامین اس بزم شبلی کی آرائش میں نوربخشی کے لیے بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں تفکری عناصر بھی ہیں اور تعلقی مباحث بھی کارفرما ہیں، ان کے سادہ اور پرسوز لہجہ نے اردو اسالیب میں خوشگوار علمی متانت کا اضافہ کیا ہے۔ اس دور کے عصری اور عبقری ذہنوں کو بے پردہ دیدنی کے لیے خاصا اچھا مواد سامنے آیا ہے۔ (پروفیسر عبدالحق، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

Printed by: Naim Book Seller, Mau (9450755820)